فرمان شناسی کے چند گوشے

سید محمد اصغر کاظمی

فرمان شناسی کے چند گوشے

سید محمد اصغر کاظمی

ناشر : سید وقار معین
0300-8408750
0321-8408750
042-37232343

سال اشاعت: 2018ء

طابع : گنج شکر پریس، لاہور

قیمت : -/895 روپے

انتساب

میں اپنی اس کتاب کو اپنے بچوں

خدیجہ کاظمی،

محمد مصطفیٰ کاظمی، احمد مجتبیٰ کاظمی،

سارہ کاظمی اور فاطمہ زہرا کاظمی

کے

نام کرتا ہوں

محمد اصغر کاظمی

فہرست

دیباچہ

ڈاکٹر شاہد ضمیر درانی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو کون نہیں جانتا؟ علم و ادب کی دنیا کے وہ ''فرمان فتح پوری'' تھے مگر ''اُردو ادب'' کے طالبعلموں کے لئے وہ ''دل دار'' تھے۔ وہ ایک جہت نما صاحبِ قلم تھے۔ فرمان صاحب کی زندگی مسلسل محنت سے عبارت رہی۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے انگریزی اور ریاضی کے اُستاد کی حیثیت سے روزگارِ زندگی کے سفر کا آغاز کیااور جامعہ کراچی میں صدر شعبۂ اُردو رہے، چیف ایڈیٹر اُردو لغت بورڈ اور رکن سندھ پبلک سروس کمیشن کے منصب تک اپنی خدمات پوری کیں۔

دراصل ڈاکٹر فرمان فتح پوری متنوع ذہنی دلچسپیوں کی حامل شخصیت کا نام ہے۔ تحقیق و تنقید میں آپ ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

سید محمد اصغر کاظمی کی کتاب ''فرمان شناسی کے چند گوشے'' فرمان شناسی کے چند زاویوں پر نظر ڈالتی ہے۔ چند زاویے اس لئے کہ فرمان صاحب نے اپنی زندگی میں 60 سے زیادہ کتب تصنیف یا تالیف کی ہیں اور برادرم اصغر کاظمی نے صرف 14 کتابوں پر مکمل اور جامع مضمون تحریر کئے ہیں۔ ان 14 کتابوں میں ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی اہم اور قابلِ ذکر اور توجہ طلب پہلو ضرور ہے۔ اصغر کاظمی کی اس تصنیف ''فرمان شناسی کے چند گوشے'' کا جب قاری مطالعہ کرے گا تو وہ فرمان صاحب کی اصل کتاب ضرور پڑھ کر ختم کرے گا۔

"فرمان شناسی کے چند گوشے" کے حوالے سے منصف نے کتاب کا عنوان ہی بڑا دلچسپ اور موضوع انگیز رکھا ہے۔ بلاشبہ میر شناس، غالب شناس، اقبال شناس، نیاز شناس، حسرت شناس، جوہر شناس، انیس شناس جیسے بڑے شاعر و ادیب اُردو ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور اصغر کاظمی نے فرمان فتح پوری کی چند اہم کتابوں کے ذریعے فرمان شناسی" کے گوشے وا کئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے متنوع موضوعات پر ساٹھ سے زیادہ کتابیں تحریر کیں ہیں۔ جو اُن کی بوقلموں علمی و ادبی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اصغر کاظمی نے ڈاکٹر صاحب کی تحقیق و تنقید کی دس کتابوں کا انتخاب کیا ہے جب کہ شخصیات کے حوالے سے چار کتابیں منتخب کیں ہیں جو اپنی نوعیت کی منفرد اور تحقیقی کتابیں ہیں۔

جناب اصغر کاظمی کی کتاب "فرمان شناسی کے چند گوشے" اس میں منتخب شدہ کتب کے عنوان بہت اہم ہیں۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کے منفرد ماہنامہ رسالہ "قومی زبان" میں شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ مضمون "ماہنامہ نگار پاکستان" میں شائع ہوئے ہیں اور پسند کئے گئے ہیں۔ ان تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے ڈاکٹر صاحب سے خلوص، محبت، احترام اور عقیدت کی روشنائی میں قلم ڈبو کر یہ مضامین قلم بند کئے ہیں اور قاری کو بھی چاہئے کہ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ مصنف فرمان صاحب سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون "اُردو کی نعتیہ شاعری" ہے جس میں ڈاکٹر فرمان

فتح پوری صاحب نے ''نعت'' کی اہمیت اور ''حمدِ باری تعالیٰ'' کا فرق واضح کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب برصغیر میں نعت گوئی پر پہلی تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ اصغر کاظمی نے ''نعت'' کا ROOT اور اس کے معنی و مفہوم کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی اُردو لغات کے ذریعے معنی و مفہوم کے ساتھ موضوعات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کے حوالے سے ابتدائی صدی کے شاعروں کے علاوہ موجودہ عہد کے کئی شاعروں کے نعتیہ کلام پر اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔

''فرمان شناسی کے چند گوشے'' اس کتاب کا دوسرا اہم مضمون ''میر انیس حیات اور شاعری'' ہے۔ فرمان صاحب کی یہ تصنیف ''میر انیس'' کے حوالے سے ایک مستند اور اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ جس میں حالاتِ زندگی سے لے کر مرثیہ کیا ہے اور ہماری شاعری میں اصطلاحی طور پر کس اصناف پر منتج ہوتی ہے۔ فرمان صاحب نے ''سلام'' کے حوالے ''میر انیس'' کی خدمات کو مکمل طور پر واضح کیا ہے۔ مشاہیر علم وادب جانتے ہیں کہ میر انیس کا تغزل ''سلام اور غزل'' کی روشنی میں واضح انداز سے نظر آتا ہے۔ اصغر کاظمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فرمان صاحب کی کتاب کے وہ ابواب جو مشکل انداز میں پیش ہوئے تھے انہیں آسان انداز میں پیش کر دیا ہے۔

اصغر کاظمی نے اپنے مطالعہ کے لئے فرمان صاحب کی اہم کتاب ''اقبال سب کیلئے'' منتخب کی ہے چنانچہ اصغر کاظمی لکھتے ہیں:

''اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونک دی ہے، ان کی شاعری نے نوجوان نسل کو درسِ عمل دیا ہے اور بتایا ہے کہ دین اور دنیا کی کامیابی

کیلئے جدوجہد، ریاضت اور حُسن عمل کے بغیر زندگی بے کار ہے‘‘۔

’’فرمان شناسی کے چند گوشے‘‘ اس کتاب میں ڈاکٹر فرمان صاحب کی نادر کتاب ’’اُردو کی ظریفانہ شاعری‘‘ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اہم تصنیف ’’اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ‘‘ تحریر کر کے بنیادی طور پر پاکستان سے محبت کا ثبوت دیا ہے اور اصغر کاظمی نے اس کتاب کو اپنے مطالعہ کا حصّہ بنا کر پاکستان اور فرمان فتح پوری صاحب سے انتہائی محبت کا ثبوت دیا ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مصنف جب ’’نگارِ پاکستان‘‘ کیلئے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے تو جب بھی ڈاکٹر صاحب کی کوئی نئی تصنیف منصۂ شہود پر آتی تو فرمان صاحب بڑی محبت اور خلوص سے اپنی کتاب اصغر کاظمی کو عنایت فرماتے اور سعادت مند اصغر کاظمی اس کتاب کو پڑھتے اور وقت نکال کر مختلف سوالات فرمان صاحب سے معلوم کرتے تھے اُس وقت ڈاکٹر فرمان صاحب بھی شاید نہیں جانتے ہوں گے کہ آخر یہ سوالات کر کے وہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آج اندازہ ہوتا ہے کہ اصغر کاظمی کے ذہن میں کیا تھا۔

آخر میں مصنف کو اس اہم کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر شاہد ضمیر درانی

اسکالر و رکن مشاورت

اُردو لغت بورڈ، کراچی

پیش لفظ

ملیحہ کرن

استاد شعبۂ اُردو،

الحمد کالج آف پروفیشنل ایجوکیشن

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا شمار اُردو ادب کی قد آور شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں عالم و فاضل تھے۔ فرمان صاحب کی کئی ادبی جہتیں ہیں۔ بحیثیت ادیب، نقاد اور ماہرِ تعلیم۔ ان کی ہر جہت معتبر رہی ہے۔ ان سب سے سوا ان کی جاذب نظر شخصیت بھی اپنی مثال آپ تھی۔ علم و ادب کا ذوق رکھنے والے بلاتکلف ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور فیض اٹھاتے۔ خود فرمان صاحب ہر وقت ان کی مدد پر آمادہ رہتے۔ اس اعتبار سے وہ ''شفقت کا سائبان'' تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب برسوں جامعہ کراچی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہے، جن لوگوں نے ان کے اندازِ تدریس کے مزے لئے ہیں وہ اکثر اُن کی وسعتِ مطالعہ، موضوع پر گرفت اور قدیم و جدید ادب پر ان کی دسترس کے تذکرے کیا کرتے ہیں۔ یہ ان ہی کا فیض تھا کہ آج فرمان صاحب کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ادب سے وابستہ ہے اور مختلف اصناف میں نمایاں کام کر رہے ہیں۔ فرمان صاحب ایک بڑے ادیب تھے۔ اگر اُنہیں اُردو ادب کا قابل فخر سرمایہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ضمن میں سید محمد اصغر کاظمی کی کتاب

''فرمان شناسی کے چند گوشے'' خاصے کی چیز ہے۔ مصنف نے فرمان صاحب
چودہ کتابوں پر اپنی تاثراتی اور تحقیقی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔

محمد اصغر کاظمی بہت ہی کہنہ مشق ذہین اور علم و ادب کے شیدائی ہیں
انہوں نے فرمان فتح پوری صاحب کے ساتھ بطور مدیر ماہنامہ ''نگار'' کے کام کر
کے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ انفرادیت کے ساتھ اپنی
بات کہہ دینے کا ہنر جانتے ہیں اور صداقت کے ساتھ لفظوں کو برتنے کا فن بھی
انہیں آتا ہے۔

سید محمد اصغر کاظمی ہمارے اُن نوجوان لکھنے والوں میں شامل ہیں جن
کے قلم میں ٹھہراؤ، فکر میں گہرائی اور رائے میں وزن ہے۔ ان کی تحریروں میں
باضابطہ مطالعہ کی گہری لکیریں بھی اُبھرتی ہیں اور اسلوبِ نگارش میں تخلیقی جھلکیاں
بھی نمایاں ہیں۔ اصغر کاظمی ہر موضوع کو گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور نتائج
اخذ کرنے سے پہلے ہر موضوع کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کو عموماً پیش نظر رکھتے
ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں نیا پن ہی نہیں فکری اضافوں کی جھلک
بھی ملتی ہے۔

محمد اصغر کاظمی جو ادب کو ایک وسیع تر تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھتے
ہیں تہذیبی اقدار سے ان کی علمی وابستگی ان کی تمام مطبوعات کو ایک نہج عطا کرتی
ہیں۔

تخلیقی شعور کی بالغ نظری کا یہی اعجاز ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ سے
زیادہ استفادہ کیا جاسکے اور نئی جستجو و دریافت کو سامنے لایا جاسکے تاکہ قاری کا

ذوق بھی زندہ رہے اور علم وفن کی راہیں بھی واضح ہوتی چلی جائیں اور علوم وفنون کی پرکھ ہوتی رہے۔ یہی علم کا اہم منصب ہے جو دیانت دارانہ و مسلسل عمل سے قائم رہتا ہے اس اعتبار سے محمد اصغر کاظمی کی کتابی صورت میں تخلیقات بڑی سود مند ہیں اور وہ کامیابی کے ساتھ تخلیقی و تحقیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ تازہ کتاب میری پسندیدہ کتابوں میں شامل ہے۔

ملیحہ کرن

استاد شعبۂ اُردو

الحمد کالج آف پروفیشنل ایجوکیشن

عرضِ مصنف

سید محمد اصغر کاظمی

مجھے زبان وادب اور ادبی کتابوں کا شوق زمانہ طالب علمی سے رہا ہے اور میں اپنے ذوق وشوق کی کتابیں حسبِ توفیق جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں اس کے ساتھ ساتھ میں نے شہر کراچی کے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کرنے کی عادت ڈال لی۔ اس عادت کے سبب میری رسائی پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے ذاتی کتب خانہ تک ہوگئی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی کہ مجھے اپنے ذاتی کتب خانہ سے فائدہ اُٹھانے کا موقع عنایت فرمائیں تو میں اس کتاب خانہ کو بے حد عزیز رکھوں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان صاحب نے بخوشی اجازت دے دی اور میں کچھ وقت فرمان صاحب کے ذاتی کتاب خانہ کو دینے لگا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے کتب خانہ کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بہت قیمتی اور اہم ذخیرہ کتب پر مشتمل ہے اس میں اُردو زبان وادب کی منتخب کتابیں ہیں۔ بہت سی کتابوں کے اولین ایڈیشن بھی یہاں موجود ہیں جن میں بعض ایڈیشن ڈیڑھ سے دو سو سال پُرانے ہیں۔

اس کتب خانہ کا ایک حصہ فرمان صاحب کی اپنی تصانیف وتالیفات کیلئے مخصوص ہے مجھے فرمان صاحب کی ان کتابوں سے استفادہ کا یہاں بھرپور موقع ملا میری دلچسپی دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی دو درجن سے زیادہ کتابیں مجھے عنایت فرمادیں جو میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں میں نے ان

کتابوں کا بغور مطالعہ کیا اور میرے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوتے میں انہیں اپنے پاس نوٹ کرتا اور وقت ملنے پر ڈاکٹر صاحب سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرتا اور اپنے علم میں اضافہ کرتا۔ ڈاکٹر صاحب میرے سوالات سے خوش ہوتے اور بڑی شفقت سے میرے سوالات کا جواب دیتے جنہیں میں نوٹ کرتا جاتا اور آخر کار میرا پورا مضمون تیار ہو جاتا۔ اس طرح فرمان صاحب کی ایک درجن سے زیادہ کتابوں پر میرے مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کو اب میں کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر شاہد ضمیر صاحب نے تحریر کیا ہے اور پیش لفظ ملیحہ کرن (اُستاد شعبۂ اُردو، الحمد کالج آف پروفیشنل ایجوکیشن) کا تحریر کردہ ہے۔ میں ان دونوں شخصیات کا ممنون ہوں کہ ان دونوں نے میری کتاب کیلئے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے 2006ء میں مجھے ماہنامہ (نگارِ پاکستان) کا معاون مدیر بنایا بعد ازاں مدیر بنا دیا جو میرے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔

میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی نوازشوں کیلئے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

سید محمد اصغر کاظمی

''اُردو کی نعتیہ شاعری'' ایک مطالعہ

نعت (ن ع ت) عربی زبان کا مادہ ہے جو عام طور پر وصف کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ لغت، میں اس کے معنی ہیں اچھی اور قابل تعریف صفات کا کسی شخص میں پایا جانا اور ان صفات کا بیان کرنا۔ عبد القدوس ہاشمی لکھتے ہیں:

''جب کوئی شخص اپنے ہم چشموں سے سب سے بلند مرتبہ اور سب سے بہتر صوری و معنوی صفات کا حامل ہو تو عربی محاورے میں کہیں گے کہ خوبی میں بہترین ہے گویا لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ مدح، حمد، تعریف، مدحت، وصف، توصیف، تحسین، تحمید، ثنا اور تسبیح کے مترادفات میں سے ہے''۔

گویا نعت وصف محمود کو کہیں گے اور وصف سے مراد کسی چیز کے عوارض اور اس کی خصوصیت کو نمایاں کرنا کے ہیں۔ عام طور پر لفظ ''نعت'' کو تعریف، ثنا، حمد، منقبت وغیرہ کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے اور اصطلاحی معنوں میں نعت اور وصف صرف حلیہ اور سراپا کے بیان کے لئے آتے ہیں۔ چنانچہ آسمانی کتابوں میں حضور نبی کریم ﷺ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ نعت اور صف ہی ہیں حضور ﷺ کی بعثت کے بعد یہ لفظ اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ عربی زبان سے فارسی زبان اور پھر فارسی زبان سے اردو زبان کے شعر و ادب میں یہ لفظ آنحضرت ﷺ کی تعریف و توصیف اور مدح کیلئے مخصوص ہو چکا ہے اور اُردو لغت میں لفظ نعت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی منظوم تعریف ہی درج کئے گئے

ہیں۔عربی میں نعت کا بیشتر حصہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد کہا گیا۔ ابتداء میں نعت کا موضوع آپ کی سیرت مبارکہ رہا جس میں شجاعت و سخاوت، دیانت و امانت، صداقت و عدالت کی تعریف کی جاتی تھی لیکن زبان و مکان کی بدلتی ہوئی صورت حال میں آپ ﷺ کی سیرت پاک کے نئے نئے پہلو ظاہر ہوتے گئے اس طرح نعت کے موضوعات میں اضافہ ہوتا گیا اس سلسلے میں تہذیبی سماجی، تمدنی، معاشرتی، سیاسی اور تاریخی بے شمار موضوعات و مضامین نعت سے آشنا ہوگئے۔ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی ذات و حیات، غزوات، معجزات، صفات اور تعلیمات کا تذکرہ بھی نعت میں ہونے لگا۔ اُردو میں نعت گوئی کا فن عربی و فارسی کے زیر اثر آگے بڑھا۔ حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن زہیر آنحضرت ﷺ کے حضور میں نعت سناتے اور آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے داد و تحسین وصول کرتے۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد امام بوصیری کا نام بہت اہم ہے جنہوں نے حب رسول ﷺ سے سرشار ہوکر قصیدہ بردہ شریف لکھا جو نعتیہ ادب میں بے حد مقبول ہوا نعتیہ شاعری کے حوالے سے اب تک بے شمار نعتیہ مجموعے شائع ہوچکے ہیں تاہم فن نعت گوئی کے حوالے سے مطبوعہ کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''اُردو کی نعتیہ شاعری'' نہایت اہم کتاب ہے جو پہلی بار ۱۹۷۴ء میں آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور کے تحت منظر عام پر آئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''تاریخی حیثیت سے اُردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں، بہت پرانی

ہے اتنی ہی پرانی جتنی خود اُردو شاعری ہے قدیم دکنی شعراء سے لے کر
آج تک اُردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں
کسی نے خاص شغف اور لگاؤ کے ساتھ کہے ہیں کسی نے محض تکلمات
سے کام لیا ہے۔ کسی نے تواتر اور اہتمام سے اس کام کو انجام دیا اور
کسی نے گاہے بگاہے طبع آزمائی کی ہے"۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

"اُردو شاعری کی دوسری اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، رُباعی وغیرہ کے
بارے میں بے شمار قیمتی مقالات لکھے گئے ہیں اور سینکڑوں تحقیقی و
تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن نعت گوئی پر چند متفرق
مضامین کے سواء کوئی مختصر کتاب بھی نظر نہیں آتی"۔

یہ کتاب اُردو کی نعتیہ شاعری کا ایک مبصرانہ جائزہ ہے۔ اس کتاب میں
جن شعراء کے نعتیہ کلام کا ذکر کیا گیا ہے ان کے کلام پر ایک نظر بھی ڈالی گئی ہے
کتاب کا پہلا باب، "نعت ایک صنف سخن کی حیثیت سے" کے عنوان سے لکھا گیا
ہے حضور نبی کریم ﷺ سے مسلمانوں کا والہانہ شغف و محبت نے مسلمانوں کی
زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا چنانچہ شعر و ادب کے شعبہ بھی اس سے متاثر ہوا جس
کے نتیجے میں شعراء نے نعتیہ کلام کہا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے
ہیں:

"نعت کا لفظ شاعری کی کسی ہیئت کی طرف نہیں بلکہ صرف موضوع کی
جانب اشارہ کرتا ہے، یعنی شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی،

غزل، رُباعی، قطعہ یا مسدس و مخمس وغیرہ کی ہئیت میں بھی نعت کہہ سکتے ہیں''۔

گویا نعت میں حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی اور سیرت کے حوالے سے بے شمار پہلوؤں کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ حضور ﷺ کی سادگی، ایثار و احسان، شرم و حیا، رحم و مروت، شفقت و محبت، عبادت و تعزیت، رقیق القلبی، انسانی ہمدردی، ہر حوالے سے حضور ﷺ کے محاسن کو نعت کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ''عربی و فارسی نعت اور اُردو پر اس کے اثرات'' کے عنوان سے ہے اُردو نعت گوئی نے عربی سے زیادہ فارسی کا اثر قبول کیا۔ اُردو نعت کو شیخ سعدی، امیر خسرو، مولانا جامی اور قدوسی نے خاص طور پر متاثر کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اُردو کی بعض دوسری اصناف سخن کی طرح نعت گوئی کے بیشتر لوازم و اسالیب بھی فارسی ہی کے زیر اثر اُردو میں آئے ہیں اور فارسی شعراء کی رہنمائی میں اُردو کے نعت گو شعراء نے آگے قدم بڑھایا ہے''۔

کتاب کا تیسرا باب ''اُردو میں نعت گوئی کی مقبولیت اور اس کے اسباب و محرکات'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''نعت گوئی کا اولین محرک مسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ حضور ﷺ کا ذکر اذکار کرنا۔ ان کی سیرت و شخصیت کی پیروی کرنا اور ان پر درود و سلام بھیجنا کارِ ثواب اور ذریعہ نجات ہے اس کا دوسرا محرک بعض علماء و

صوفیاء کا وہ شغف و توجہ ہے جو انہوں نے نعت پر صرف کی ہے۔ نعت گوئی کا تیسرا بڑا محرک میلاد شریف کی محفلوں کا انعقاد رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کی کسی اور صنف سے عام مسلمان واقف ہوں یا نہ ہوں لیکن نعت کا نام اور اس کا اصطلاحی مفہوم سب جانتے ہیں"۔

صوفی شعراء نے بھی نعت کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کتاب کا اگلا باب "اُردو کی نعتیہ شاعری کا مبصرانہ جائزہ" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں مختلف شعراء کے حوالے سے ان کی نعتیہ شاعری کا جائزہ عمدگی سے لیا گیا ہے مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر:

زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

پُرانے شعراء میں کرامت علی خان شہیدی اور غلام امام شہید نے نعت گوئی کے معیار کو قدرے بلند کیا شہیدی کے یہ اشعار مشہور ہیں:

رقم پیدا کیا گیا طرفہ بسم اللہ کے مد کا
میرا دیواں میں لکھا ہے میں مطلع نعت احمد کا
ہوئی ہے ہمت عالی مری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیرے مرقد کا

غلام امام شہید نے بھی نعت کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ شہید نے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں بلند پایہ نعتیں کہی ہیں ان کی کتاب میلادِ شہیدی بھی مقبول ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اُردو میں نعت گوئی کا مقبول ترین اور کامیاب ترین دور محسن کاکوروی اور امیر مینائی سے شروع ہوتا ہے دونوں نے نعتیہ شاعری میں ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، محسن کاکوروی اور امیر مینائی کی طرح مولانا حالی نے بھی اسلامی اقدار اور نعت کے موضوع پر گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ حالی کے اشعار ہر قسم کے تکلف سے پاک ہیں۔ ان میں نہ تو فکر و خیال کی جدت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے نہ کسی قسم کے مبالغے یا لفظی اہتمام سے کام لیا گیا ہے نہ غیر ضروری معنی آفرینی کو جگہ دی گئی ہے''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب میں علامہ محمد اقبال اور مولانا ظفر علی خان کی نعت گوئی کے حوالے سے تفصیل سے لکھا ہے اس کے ساتھ ساتھ صوفی شعراء شاہ نیاز احمد بریلوی اور بیدم وارثی کی نعتیہ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ نعت گوئی کے حوالے سے نہایت اہم نام مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری کا محور خاص آنحضرت ﷺ کی زندگی و سیرت تھی مولانا صاحب شریعت بھی تھے اور صاحب طریقت بھی۔ صرف نعت و سلام اور منقبت کہتے تھے اور بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ کہتے تھے سادہ بے تکلف زبان اور برجستہ و شگفتہ بیان ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہیں''۔

مولانا رضا احمد بریلوی کے چھوٹے بھائی حسن رضا خان کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے بھی اس کتاب میں جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حسن

رضا خاں کی نعتیہ شاعری میں سادگی و صفائی بیان کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات عشقیہ کی وہ شدت ہے جو آنحضرت ﷺ سے ان کے والہانہ لگاؤ کا ثبوت ہے۔ اُردو نعت گوئی کے حوالے سے غلام مصطفیٰ عشقی کی نعت گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''اُردو کی نعتیہ شاعری'' اس کتاب میں سید واحد علی وحید، پنڈت ہری چند اختر، تلوک چند محروم، عرش ملیسانی، مہاراجہ کشن پرشاد، امر چند قیس، منور لکھنوی اور جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مولانا علی احمد اسیر بدایونی، اکبر وارثی میرٹھی، اقبال سہیل، حمید صدیقی، بہزاد لکھنوی، حفیظ جالندھری، مولانا ضیاء القادری، مولانا ماہر القادری، محشر رسول نگری، عبدالعزیز خالد، حافظ لدھیانوی، اعظم چشتی، عبدالکریم ثمر اور حفیظ تائب کی نعت گوئی کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

کتاب کا آخری باب ''تبرکات'' کے عنوان سے جس میں معروف نعت گو شعراء کا نمونہ کلام پیش کیا گیا مثلاً شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے

بلغ العلیٰ بکمالہ

کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلوا علیہ و آلہ

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے اشعار

یا صاحب الجمال و یا سید البشر

من وجہک المنیر لقد نور القمر

لایمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر

امیر خسرو کے اشعار میں ایک شعر یہ بھی درج ہے

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتاں آذری
ہر چند وصف می کنم در حسن زاں زیبا تری

مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حوالے سے یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے

سلام علیک اے نبی کرم
مکرم تر از آدم و نسل آدم

حاجی محمد جان قدسی کا شعر یہ درج ہے

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اسد اللہ غالب، شاہ نیاز احمد بریلوی، علامہ محمد اقبال، امیر مینائی، محمد اسماعیل میرٹھی، اختر شیرانی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، علی اختر حیدرآبادی، اکبر الہٰ آبادی، اکبر وارثی، اقبال وارثی، اقبال سہیل، احسان دانش، افقر موہانی، احمد ندیم قاسمی، محمد اعظم چشتی، امیر بدایونی، ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، اختر حسین اختر، اطہر نفیس، ڈاکٹر ابراہیم خلیل، بیدم وارثی، بیدل جبلپوری، بہزاد لکھنوی، بیان یزدانی، حفیظ تائب، ثروت حسین، عبدالکریم ثمر، محمد علی جوہر، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، الطاف حسین حالی، حسرت موہانی، حسن رضا بریلوی، حفیظ جالندھری، حمید صدیقی، عبدالرحمٰن راسخ، احمد رضا بریلوی، روش صدیقی، شاہ

محمد تقی، ساغر نظامی، سحر انصاری، کرامت علی شہیدی، غلام امام شہید، شفیق کوٹی اور دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نعت بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نعت کا یہ شعر دیکھتے چلئے

فاران کی چوٹی پر چمکا خورشید رسالت کیا کہنا
ایمان کی کرنوں سے پھیلی ہر سمت حرارت کیا کہنا

اُردو کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے یہ کتاب نہایت اہم ہے تحقیق کے حوالے سے کام کرنے والوں کیلئے یہ ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

(مطبوعہ: ماہنامہ "الانسان" کراچی)

جنوری ۲۰۱۶ء

”میر انیس حیات اور شاعری“ ایک مطالعہ

”میر انیس حیات اور شاعری“ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک اہم کتاب ہے۔ جو نو ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مطالعہ میر انیس کے سلسلہ میں یہ ایک مستند کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ماخذات کا حوالہ بڑی تفصیل سے دیا گیا۔ باب اول میں میر انیس کا خاندان اور حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

> ”میر انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے، جہاں ان کا خاندان ایک مدت سے مقیم تھا وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ اس لئے ان کی ساری تعلیم و تربیت فیض آباد میں ہوئی۔ فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور والد سے حاصل کی، مولانا سید علی لکھنوی سے اس کی تکمیل کی۔ منطق و فلسفہ کا درس مفتی قزلباش سے لیا“۔ (صفحہ ۳۳)

میر انیس نے مکتبی تعلیم کے علاوہ سپہ گری، ورزش، پٹہ، بانک اور بنوٹ کے فن میں بھی مہارت حاصل کی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس باب میں میر انیس کی شخصیت، وضع قطع، شاعری کا آغاز، تخلص، لکھنؤ میں سکونت، انداز مرثیہ خوانی، حیدر آباد، عظیم آباد، الہ آباد اور بنارس کے سفر کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ہے ”مرثیے کا مفہوم، موضوع اور

اجزا و کردار" اس باب میں مرثیے کا لغوی مفہوم، اصطلاحی مفہوم، مرثیے کی ہیئت، مرثیے کا موضوع، موضوع کی عظمت، موضوع کی وسعت، مرثیہ اور رزمیہ، مرثیہ اور ڈرامائی عناصر، مرثیے کے اجزائے ترکیبی، مرثیے کے کردار کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ہماری شاعری کی اصطلاح میں مرثیہ صرف ایسی نظم کو کہتے ہیں جو شہدائے کربلا اور ان کے واقعات و تاثرات کے ذکر و اذکار پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان خاص معنوں میں مرثیہ کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا۔ حتیٰ کہ عربی و فارسی شاعری کی تاریخ بھی مرثیے کے اس اصطلاحی مفہوم سے ناآشنا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے ہاں جسے مرثیہ کہتے ہیں وہ صرف اُردو والوں کی ایجاد ہے"۔ (صفحہ ۴۴)

باب سوم کا عنوان ہے۔ "میر انیس کی مرثیہ نگاری کی نوعیت و جامعیت" اس باب میں میر انیس کی مرثیہ نگاری کا پس منظر، گھر کی سازگار فضا، خارجی ماحول، راہ کی دشواریاں، میر انیس کی کامیابی، حسن آفرینی اور مراثی انیس، میر انیس کا اسلوب فن، اسلوب کی جامعیت، غزل اور مرثیہ، قصیدہ اور مرثیہ، مرثیہ اور مثنوی، مرثیہ اور رزمیہ، انیس کے اسلوب کی انفرادیت، مراثی انیس، کے مطالعہ کے اہم پہلو کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"میر انیس کے مطالعہ کے وقت ہمیں فی الوقت جملہ اصنافِ سخن کا لطف

آ جاتا ہے۔ انیس کے سلاموں سے قطع نظر جن میں وہ پورے غزل گو نظر آتے ہیں ان کے مراثی کے بعض ٹکڑوں میں ان کی شاعری کا لب ولہجہ غزل سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ جب وہ اہلِ بیت کے باہمی جذباتِ محبت کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے اشعار میں ایسا گداز، ایسا لوچ، ایسی نرمی، ایسی خنکی اور ایسی شگفتگی و وارفتگی نمایاں ہو جاتی ہے جسے تغزل کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر ہی نہیں کیا جا سکتا"۔ (صفحہ ۸۴)

باب چہارم "میر انیس اور محاسنِ زبان و بیان" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں میر انیس کی قادر الکلامی، میر انیس کی زبان، سادگی و پُر کاری، لکھنؤ اور دلی کی زبانوں کا امتزاج، میر انیس کی فصاحت و بلاغت، الفاظ کا انتخاب، روزمرہ و محاورات، تشبیہ و استعارات، صنائع، لفظی و معنوی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمان صاحب لکھتے ہیں۔

"میر انیس کی نظم نگاری کا موضوع کچھ ایسا وسیع و عظیم ہے کہ اس میں زندگی کے بے شمار لطیف و دقیق اور نفیس اور پیچدار تصورات و افکار زیر بحث آتے ہیں۔ ان تصورات و افکار سے پیدا ہونے والی کیفیات و تاثرات کو دوسروں تک پہنچانے کیلئے میر انیس کو نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارات ایجاد کرنے پڑے ہیں۔ اس ایجاد نے ان کے کلام کو حسین بھی بنایا ہے اور اس میں معنی کی لچک بھی پیدا کی ہے۔"

(صفحہ ۱۰۴)

باب پنجم میں ''میر انیس کی معنوی خصوصیات'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں مناظر قدرت، جذبات کی عکاسی، واقعات کی مصوری ڈرامائی عناصر اور مکالمات، اخلاقی مضامین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''میر انیس کی افتادِ طبع نے مرثیوں کے بعض ٹکڑوں کو غزل کے آب و رنگ سے بہت قریب کر دیا ہے''۔

باب ششم کا عنوان ہے ''میر انیس کا تغزل۔ سلام اور غزل کی روشنی میں'' جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''میر انیس کے سلاموں کا رنگ آہنگ بالکل غزل جیسا ہے۔ یہی وہ متغزلانہ صفات ہیں جن کی بنا پر میر انیس کے سلام، غزل کی طرح عام وخاص سب میں بہت مقبول رہے ہیں''۔ (صفحہ۱۸۲)

اس باب میں میر انیس کے کلام کی نوعیت، مضامین و اسلوب، سلام و غزل کے تماثل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب ہفتم، میر انیس کی رباعیات کے بارے میں ہے۔ جس میں رُباعی کا فن اور اس کی مشکلات، اُردو کے ممتاز شعراء رُباعی کی مقبولیت میں میر انیس کا حصہ، میر انیس اور رُباعی کے موضوعات، اُردو میں اخلاقی شاعری اور رباعیاتِ انیس، رُباعیات انیس کی قسمیں بلحاظ موضوعات میر انیس اور میرزا دبیر کی اہم موضوع رُباعیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب ہشتم کا عنوان ہے ''میر انیس تذکروں کی روشنی میں'' اس مضمون

میں جن جن تذکرہ نگاروں نے میر انیس کا ذکر اپنے تذکروں میں کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان کی تفصیل دی ہے۔ اس سلسلے میں سراپا سخن مولفہ سید محسن علی، تاریخ ادب ہندوستانی مولفہ گارسین، خوش معرکہ زیبا مولفہ سعادت خاں ناصر، گلستان سخن، سخن شعرا، بزم سخن، ارمغان گوکل پرشاد، انتخاب نقص، سنان دلخراش، رسالہ تطہیر الاوساخ، ردِ فساخ، گستاخی معاف اور دیگر تذکروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

باب نہم بعنوان ''میر انیس کے اولین نقاد'' ہے۔ جس میں محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولانا شبلی، حکیم امجد علی شہری، امداد امام اثر، سید مہدی حسن احسن لکھنوی کو شامل کیا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد کے نزدیک میر انیس معنی آفرین ہیں اور ان کے کلام میں فصاحت، صفائی کلام، حسین بیان، لطیف محاورہ اور سہل ممتنع کی صفات پائی جاتی ہیں۔ مولانا حالی کے خیال میں میر انیس نے اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا اور اُردو شاعری میں جو کہ مرثیہ کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔

کتاب کے آخری حصہ میں ماخذات کا ذکر ہے اس طرح میر انیس کے بارے میں یہ نہایت قابلِ قدر کتاب تسلیم کی جائے گی۔

(مطبوعہ جریدہ نقاد اُردو کراچی، ستمبر ۲۰۱۳ء)

اقبال سب کے لئے۔ ایک مطالعہ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ اُردو کے اہم شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اس کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونک دی۔ ان کی شاعری نے نوجوان نسل کو درسِ عمل دیا اور بتایا کہ دین اور دنیا کی کامیابی کے لئے جدوجہد، ریاضت اور حُسنِ عمل کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

علامہ محمد اقبالؔ کے لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی کتاب ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا ہے۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ وایقان دوش بدوش کارفرما ملتا ہے''۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ بیسویں صدی کے عظیم مفکر اور شاعر ہیں۔ جنہوں نے مشرق و مغرب دونوں کو متاثر کیا۔ علامہ کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں جو نوجوان نسل کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کتاب جناب پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ہے جس کا عنوان ہے ''اقبال سب کے لئے'' ۵۵۱ صفحات کی یہ کتاب ۱۳ ابواب پر مشتمل

ہے۔ ہر باب میں بڑی تفصیل کے ساتھ علامہ کی شخصیت اور فکر وفن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''کتاب کے موضوع اور عنوان کے پیشِ نظر اسے ہر طرح جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب اقبال کی زندگی اور فکر وفن کے سلسلے میں اساسی اور بنیادی نوعیت کا مواد فراہم کرے گی''۔

کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے ''ماحول، زندگی اور شخصیت''

انیسویں صدی کی آخری دہائیاں برصغیر کے مسلمانوں کیلئے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور مسلمان مایوسی اور نااُمیدی کی زندگی گزار رہے تھے کہ سرسید احمد خاں نے اس صبر آزما دور میں مسلمانوں کو حوصلہ دیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان کی مدد کی۔ سرسید کے ساتھ اُن کے رفقاء نے بھی اپنے اپنے انداز میں برصغیر کے مسلمانوں اور اُردو زبان کی خدمت کی۔ اس پُر آشوب دور میں علامہ محمد اقبال نے آنکھ کھولی۔ پروان چڑھے پھر رفتہ رفتہ برصغیر کے مسلمانوں اور شعر وادب کے حق میں سرسید کے خواب کی تعبیر بن گئے۔ علامہ محمد اقبال کے آبا واجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے جہاں اقبال کی پیدائش ہوئی۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بعد ازاں اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہوئے جہاں مولانا میر حسن عربی و فارسی کے استاد تھے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان چلے گئے۔ پی ایچ ڈی کیا اور قانون کی ڈگری حاصل کی۔

کتاب کے اس پہلے باب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اقبال کی تعلیم، شادیاں، اولاد، ملازمت، وضع قطع، سادگی و شرافت، شعر گوئی، تصوف و دینی مسائل سے دلچسپی، قرآن و رسالت حاصلِ زندگی، وفات و وصیت کے بارے میں بڑی تفصیل اور حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ''تصانیفِ اقبال'' کے عنوان سے ہے جس میں تصانیف اقبال کی رنگا رنگی، اسلوب نثر، شعری مجموعے، مکتوبات، مضامین، خطبات و تقاریر و مقالات کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال نہ صرف ایک عظیم شاعر اور مفکر تھے بلکہ ایک عظیم مصنف بھی تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے شعری مجموعوں کے ساتھ ساتھ اُردو شعراء کی روشِ عام کے برعکس نثر میں بھی کئی مستقل اور بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ اقبال کی نثر ان کے کلام سے کم اہم نہیں، بلکہ ایک لحاظ سے قدر و قیمت میں نظم سے بھی زیادہ ہے''

(اقبال سب کیلئے، ص ۶۰)

شعری مجموعوں کے ساتھ ساتھ اقبال کی نثری تحریریں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اس حوالے سے کتاب کا یہ باب نہایت اہم ہے ''اقبال سب کے لئے'' کتاب کا تیسرا باب ''پیغامِ حیات اور فلسفۂ خودی و بے خودی'' کے عنوان سے ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے خودی کا درس دیا۔ ان کے

نزدیک جس قوم میں خودی نہیں ہے وہ مردہ ہے۔ خودی انسان کو خصائل رزیلہ سے بچاتی ہے اور فرائضِ زندگی سے آگاہ کر کے بندگانِ خدا بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس باب میں خودی کا روایتی و اصطلاحی مفہوم، فلسفۂ خودی تلاشِ ذات کا حاصل، فلسفۂ خودی کی ارتقائی منزلیں، سعیِ مسلسل اور عملِ پیہم، ضبطِ نفس، اطاعت اور نیابتِ الٰہی، خودی اور بے خودی کے رشتے، انفرادی و اجتماعی خودی، توحید و رسالت خودی کی اساس جیسے اہم عنوانات پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خودی کے اوصاف میں اقبال کے بے شمار بیانات ان کی تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں اور بے شمار ایسے اشعار ہیں جن میں خودی کا والہانہ تذکرہ آیا ہے۔ اقبال کا یہ فلسفۂ حیات یا پیغام خودی جس پر اس نے اتنا زور دیا ہے وہ فرد و قوم کی بقا و ترقی کی اساس ٹھہرایا ہے، جذبات کے لمحاتی جوش کا نہیں بلکہ انسان کے نفس اور اس کی تہذیبی زندگی پر کامل غور و فکر کا نتیجہ ہے''۔

(اقبال سب کے لئے، ص ۹۵)

''اقبال سب کے لئے'' کتاب کا چوتھا باب ''تصورِ تعلیم'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں لفظ تعلیم کی وضاحت، تعلیم کا مفہوم، تعلیمی مسائل سے اقبال کی وابستگی، مروج نظامِ تعلیم اور نصابی ضرورتیں، مشرق کا مدارس و نظامِ تدریس کی خرابیاں، تعلیم کے ساتھ تربیت کی اہمیت، تربیت کی کمی کے مہلک اثرات، مغرب کا نظامِ تعلیم اور اس کے نقائص۔ روحانیت پر مادے کی حکمرانی،

تہذیب وتمدن کی تباہی، اہلِ مغرب کی قوت کا راز، کردار سازی اور قومی مزاج کی تشکیل میں تاریخ کے مضمون کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اقبال کے نزدیک ہماری درس گاہیں دانش وحکمت کی راہیں تو کھول دیتی ہیں لیکن زندگی کا ولولہ پیدا نہیں کرتیں۔ اقبال فرماتے ہیں:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سُراغ

اقبال مزید فرماتے ہیں:

یہ علم و حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
جو قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

کتاب کے اس باب کا خاتمہ نہایت عمدہ انداز سے ہوا ہے۔

''اقبال سب کے لئے'' کتاب کا پانچواں باب ''سیاسی افکار وتحریکِ پاکستان'' کے عنوان سے قلم بند کیا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبال بلند پایا مفکر ہیں۔ انہوں نے سوئی ہوئی مسلمان قوم کو بیدار کیا اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کیلئے جدید تقاضوں کے عین مطابق بہتر

مستقبل کی تشکیل کی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال نے صرف مغرب کے جمہوری نظام کو نہیں بلکہ دنیا کے ہر ایسے سیاسی نظام کو جس کی بنیاد لادینی پر رکھی گئی ہے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے، چنانچہ انہوں نے کارل مارکس کے سیاسی نظام یعنی اشتمالیت کو اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں سراہا ہے۔ لادینی سیاسی نظاموں کے خلاف ان کا احتجاجی لب وہ لہجہ شروع سے آخر تک ان کی شاعری میں باقی رہتا ہے''۔ (''اقبال سب کے لئے''، ص ۱۵۸)

اس باب میں اقبال کی کامیابی کے اسباب، فکروفن کے سیاسی محرکات، سیاسی واقعات و ملی تحریکات، تقسیمِ بنگال اور اس کی تنسیخ، مسلم لیگ کا قیام، جداگانہ انتخاب کی تحریک، تحریکِ خلافت، قومیت کا تصور، عملی سیاست میں حصہ، مسلم لیگ میں شمولیت، الٰہ آباد کا تاریخی خطبہ اور تصورِ پاکستان جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''اقبال سب کے لئے'' کتاب کا چھٹا باب ''دنیائے اسلام اور اقبال'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں اسلام اور ملّتِ اسلامیہ سے اقبال کی ذہنی وابستگی، لادینی نظامِ حیات سے بیزاری اور دینی معاشرے کی آرزومندی، مغرب کا نظامِ تمدن اور مادّیت پرستی، مغرب کے تصورِ قومیت و وطنیت کے خلاف احتجاج، اسلامی قومیت اور اس کے اجزائے ترکیبی، ہندی مسلمانوں کے تاریخی کارناموں پر افتخار، زوالِ ملت پر اشک باری، تابناک مستقبل کی آرزو اور نظموں کا رجائی لب و لہجہ، مشرقی و مغربی تمدن کے امتیازات، مشرق پر مغرب کی جارحیت، مسلم ممالک کی مرعوبیت و محکومی، اہلِ مغرب کا فریب، علامہ کی پیش گوئی، اقوامِ مشرق سے خطاب

جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال نے مسلمانوں کو مغربی تمدن کے خطرات اور اس کی پیروی کے نقصانات سے آگاہ کیا، ساتھ ہی انہیں شان دار ماضی کی داستان سنا کر ان میں ایک طرح کا جوش ولولہ پیدا کیا۔ اقبال کو ملتِ اسلامیہ اور اقوامِ مشرق کے مسائل سے طبعاً گہری دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے صرف ایک عمومی یا اجتماعی مخاطبے کو کافی نہیں سمجھا۔ انہوں نے ہر اسلامی ملک اور ملت سے انفرادی مخاطبے کو بھی ضروری جانا۔ انہیں ماضی کی عظمت کا احساس دلایا اور روشن مستقبل کی بشارت دی''۔

(اقبال سب کے لئے، ص ۱۹۵)

کتاب ''اقبال سب کے لئے'' کا ساتواں باب ''اقبال کا فن اور نظریۂ فن'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں آرٹ یا فن کیا ہے؟ تخلیقِ فن اور حسن آفرینی، حسن کی ماہیت اور جمالیات کے مفکرین، شعر و ادب میں حسن آفرینی کی نوعیت، علامہ کا افادی نقطۂ نظر، تصورِ فن کی ارتقائی منزلیں، مختلف ادوار، فن میں رمز و ایمائیت کی اہمیت، شاعر کا خلوص یا خونِ جگر، ادب میں مقصدیت کا مقام، شاعری اور فلسفے کی حدود، فنونِ لطیفہ میں شاعری لطیف ترین، شاعری میں قومی اور بین الاقوامی زندگی کا عکس، حیاتِ انسانی میں شاعری اور شاعر کا منصب، تخلیق و تعمیر کا تعلق، شاعری قوت کی مظہر و خالق، ادب برائے ادب سے بیزاری، افادی ادب کی تائید و تخلیق، شاعری وسیلۂ تبلیغِ مقاصد، شاعری اور نصب العین سے اس کا رشتہ، منطقی اور شعری صداقتوں کے بارے میں

اقبال کا موقف، رجائی لب ولہجہ اور خوش آئند مستقبل کی بشارت، شاعری غیر معمولی تخلیقی عمل، موسیقی، مصوری اور فنِ تعمیر کا جمال و جلال، مسلمانوں کے کارنامے، فنونِ لطیفہ کی اہمیت اور تمدنِ انسانی کی تاریخ میں ان کا مقام'' جیسے اہم موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال نے شاعری کو قوت کا مظہر اور خودی کا پاسبان بنانے پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ کسی اور نوع کی شاعری کو خواہ وہ کیسی ہی طربناک و دلآ ویز کیوں نہ ہو شاعری نہیں سمجھتے۔ ادب برائے ادب کے شائقین اور شاعری کو تفریحِ طبع کا مشغلہ سمجھنے والے ان کے نزدیک بے بصر اور روحِ شاعری سے بے خبر ہیں۔ (اقبال سب کے لئے، ص ۲۳۹)

ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''اقبال کا سارا کلام شاہد ہے کہ انہوں نے فن اور تخلیقِ فن کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر خود بھی خلوصِ نیت کے ساتھ عمل کیا ہے اور یہ ان کے اسی خلوص کا نتیجہ ہے کہ ان کا فن رنگ و نسل کے جغرافیائی دائروں تک محدود نہیں رہا بلکہ اپنے انفرادی جمال و جلال کے سبب آفاقی بن گیا ہے''۔ (حوالہ بالا، ص ۲۵۷)

''اقبال سب کے لئے'' کتاب کا آٹھواں باب ''اقبال کا تصورِ عقل و عشق'' کے عنوان سے قلم بند کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے عشق اور اس کے مترادفات، کلامِ اقبال کا مرکزی نقطہ، محبت کی شاعرانہ تعبیر، عشق اور خودی کا تعلق، عشق ایک طاقتور محرکِ حیات، کارفرمائیاں اور کارکشائیاں، اُردو، فارسی شاعری میں عشق کی روایت، صوفیاء کا عشق، وحدت الوجود اور اس کے معتقدات، اقبال کا ردِعمل اور نقطۂ نظر، عشق، زندگی کا ایک رجائی پہلو، طلب دیدار اور وصال کا تصور، ہجر و وصال کا نیا موقف، عشق اور علم و فکر، علم و فکر کی رسائیاں، عشق کے کارنامے، عقل و عشق کی پختگی و خامی، دانش برہانی اور عشق۔ اقبال کا انفرادی تصور جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

''اقبال کے نزدیک محض اضطراری کیفیت، ہیجانِ جنسی، حواس باختہ از خود رفتگی، فنا آمادگی یا محدود کو لامحدود میں گم کرنے دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں عشق کا نام ہے ایک عالمگیر قوتِ حیات کا جذبۂ عمل سے سرشاری کا حصول مقصد کے لئے بے پناہ لگن کا، عزم و

آرزو سے آراستہ جہدِ مسلسل کا"۔ (حوالہ بالا، ص ۲۷۷)

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

"اقبال سب کے لئے" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اس کتاب کا نواں باب ہے۔"اقبال پر مشرق و مغرب کے اثرات" اس باب میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"دنیا کے عظیم مفکروں اور شاعروں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا ذکر اقبال کے کلام میں نہ آیا ہو جس کے افکار و خیالات سے انہوں نے حسبِ ضرورت استفادہ نہ کیا ہو، لیکن یہ استفادہ اقبال کے یہاں تقلیدی نہیں رہا تخلیقی بن گیا ہے"۔ (حوالہ بالا، ص ۳۳۴)

اس باب میں فکر و فن کے ماخذ، مشرق کے اثرات، قرآن و رسالت، مشرقی حکما و صوفیا اور شعرا، مجدد الف ثانی، مولانا رومی گوئٹے سے اقبال کی عقیدت کا سبب، اقبال اور برگستان کی ملاقات، اقبال کی انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"اقبال سب کے لئے" اس کتاب کا دسواں باب "اُردو شاعری" کے

عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔اقبال کی شاعری میں فکر کی بلندی اور رفعتِ خیال آخری حدود کو چھو رہی ہے۔ ان کے جذبات و احساسات میں خلوص اور تڑپ ہے اور یہی اظہار ان کی شاعری میں سوز و گداز اور داخلیت کا عنصر پیدا کر دیتا ہے۔فرماتے ہیں:

رہی نہ زہر میں اقبال وہ پُرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں
اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بُلبُل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گُل مجھے

اس باب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ محمد اقبال کی شاعری میں معنویت اور اس کے موضوعات، مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات، شعری مجموعوں کا انفرادی مطالعہ، بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز ان کی اہم اور طویل نظمیں، غزل گوئی اور خصوصیات و اضافات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

"اُردو غزل کے ناقدین میں سبھی نے اقبال کو ایک منفرد اور بلند پایہ غزل گو تسلیم کیا ہے اور ان کے لب ولہجہ کی غنائیت و تازگی کی داد دی ہے"۔ (اقبال سب کے لئے، ص ۳۱۴)

''اقبال سب کے لئے'' اس کتاب کے گیارہویں باب کا عنوان ہے ''فارسی شاعری'' اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے برصغیر کی فارسی شاعری، صفِ اوّل کے شعراء، امیر خسرو، فیضی، بیدل، غالب، فارسی سے اقبال کی دلچسپی و مہارت، شعر گوئی کیلئے فارسی کا انتخاب، حافظ، بیدل، نظیری اور غالب کا اثر، پیر رومی و مرید ہندی، شعری موضوعات و مسائل، اسلوب و جوشِ بیان، موسیقیت و ترنم، شعری مجموعے اور ان کے امتیازات، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر، ارمغانِ حجاز جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال کی بعض تحریروں اور شعروں سے پتا چلتا ہے کہ ان کے اس شعور و ادراک نے کہ اُردو کی بہ نسبت فارسی میں صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے اور اس کے ذریعے ان کا پیغام برصغیر سے باہر اسلامی ممالک اور یورپ تک پہنچ سکتا ہے۔ انہیں فارسی گوئی کی طرف مائل کیا''۔

(اقبال سب کے لئے، ص ۴۲۲)

فارسی گوئی میں اقبال نے حافظ، بیدل، نظیری اور غالب کا بھی گہرا اثر قبول کیا ہے اور ان کے اسلوب شاعرانہ پر ان کے اثرات کی جھلکیاں بہت نمایاں ہیں۔ خاص طور پر مولانا روم سے اقبال نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ اُردو کے مقابلے میں اقبال کے فارسی کلام کی مقدار بھی زیادہ ہے اور اس کی اثر پذیری

بھی اُردو کی بہ نسبت شدید تر ہے۔ فرماتے ہیں:

نعرہ زن عشقِ کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

''اقبال سب کے لئے'' کتاب کا بارہواں باب ''اقبال اور نئی نسل'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں اقبال مستقبل کا شاعر، مخاطبے کی نوعیت، فلسفۂ حیات کا مستقبل سے تعلق، زندگی، ندرتِ فکر و عمل اور انقلاب کے رشتے، ماحول و ماحضر سے بیزاری، انقلاب و قوت کا تعلق، اقبال کے فلسفۂ حیات میں قوت و عمل کی اہمیت، نوجوانوں سے خطاب، نئی نسل اور نوجوانوں کا نمائندہ، نئی نسل کو اقبال کا پیغام، نوجوانوں کی افسردگی اور اہلِ رہبانیت، شاہین نئی نسل کا دوسرا نام، شاہین کی خصوصیات، درویشی و خوداری، تیز نگاہی و بلند پروازی'' جیسے اہم موضوعات پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال کو نئی نسل سے یہ بھی شکوہ ہے کہ وہ تن آسان، بے عمل اور بے قوت ہوتی جارہی ہے۔ مغرب پرستی کا رجحان اتنا غالب آ گیا ہے کہ اپنی چیزوں کی قدر و قیمت اس کی نظروں سے گرتی جارہی ہے اور غیر کی ہر چیز محترم بنتی جارہی ہے، چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے اس ذکر سے ان کی مراد نوجوان کی سیرت و کردار ہے''

(اقبال سب کے لئے صفحہ ۵۲۲)

علامہ محمد اقبال فرماتے ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

☆☆☆☆

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

☆☆☆☆

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

"اقبال سب کے لئے" اس کتاب کا آخری باب "علمی و ادبی دنیا پر اقبال کے اثرات" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس باب میں اندرونِ و

بیرونِ ملک اقبال کی شہرت، مشرق و مغرب میں اقبال کے معاصرین، ہم عصروں میں اقبال کی اہمیت و انفرادیت مختلف اصناف میں اقبال کی جدتیں، ملّی و قومی زندگی پر اثرات، برصغیر سے باہر اقبال کی مقبولیت، اقبال کی عظمت کا اعتراف، اقبال کی مقبولیت و شہرت کے امکانات" جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"اقبال نے اپنے فکر و فن کی تخلیق و تعمیر میں جہاں دوسروں سے بہت کچھ لیا ہے وہاں زمانے کو بہت کچھ دیا بھی ہے۔ ان کی یہ دین اپنے گرد و پیش یعنی برصغیر کے علاقوں تک محدود نہیں رہی بلکہ بیرونی دنیا پر بھی اس نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ یورپ، امریکہ، روس اور ممالکِ اسلامیہ ہر جگہ ان کی فکر و فن کے مطالعے کو بہت اہمیت دی گئی ہے"۔

(اقبال سب کے لئے، ص ۵۲۹)

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو احساسِ کمتری سے نجات دلا کر انہیں آنے والے دور کے تقاضوں سے عہدہ براہونے کیلئے تیار کیا اور فرمایا:

کھول کر آنکھ میرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ

ڈاکٹر صابر کلوروی شعبہ اُردو پشاور یونیورسٹی لکھتے ہیں:

"فرمان فتح پوری نے اس کتاب میں اقبال کے ذہنی ارتقاء کی کڑیاں ملانے کی کامیاب کوشش کی ہے"۔

(حوالہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال و آثار، ص ۱۴۱)

''اقبال سب کے لئے'' اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا خیال یہ ہے کہ:

''اقبال کے سلسلے میں فرمان فتح پوری کا کام طلبہ کی ضروریات کو احسن طور پر پورا کرتا ہے۔ ان کی کتاب میں اقبال کے کلام اور افکار پر اس انداز سے نظر ڈالی گئی ہے کہ وہ اقبال فہمی میں بہت معاون ثابت ہوئی ہے''۔

(حوالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال و آثار، ص ۱۵۴)

''اقبال سب کے لئے'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک اہم تصنیف ہے جو تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے،

مطبوعہ: ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی، اپریل ۲۰۱۴ء

''اُردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے''

اُردو شاعری میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز سترھویں صدی عیسوی میں جعفر زٹلی سے ہوا۔ جنہوں نے اپنے اشعار میں روسا اور شاہان و شہزادگان کو طنز کا نشانہ بنایا۔ اُن کے بعد سودا اور میر تقی میر نے ظرافت نگاری کی جانب توجہ دی۔

مرزا محمد رفیع سودا نے اپنی ہجویات سے اُردو شاعری میں طنز و ظرافت کا رنگ پیدا کیا، ان کی زیادہ تر ہجویات ذاتیات تک محدود رہیں لیکن اُنہوں نے اپنے عہد کے حالات پر بھی بھرپور طنز کیا ہے، اُن کا قصیدہ ''تضحیکِ روزگار'' اس کی بہترین مثال ہے، اگرچہ میر تقی میر نے بھی ہجویات لکھی ہیں لیکن اس حوالے سے سودا کا نمبر آگے ہے۔ انشاء نے بھی ظرافت نگار کے طور پر شہرت پائی۔

قدیم شعراء میں نظیر اکبر آبادی اور مرزا غالب کے یہاں بھی طنز و مزاح کے بعض کامیاب نمونے ملتے ہیں لیکن اُردو کی ظریفانہ شاعری کے حوالے سے بھرپور شہرت اکبرالہٰ آبادی کے حصے میں آئی۔

اکبرالہٰ آبادی کی طبیعت کو طنز و مزاح سے خاص مناسبت تھی۔ اُنہیں ماحول بھی ایسا ہی ملا جہاں سماجی ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں تھیں، چنانچہ انہوں نے اس ماحول سے پورا فائدہ اُٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری کو قبولِ عام کی سند جلد مل گئی۔ اکبر نے بذلہ سنجی، رعایتِ لفظی اور تہذیبی تضادات سے طنز و مزاح کے شائستہ زاویئے تراشے، ان کی ظرافت کا رنگ کسی ایک موضوع کے لئے مخصوص نہ تھا۔ انہوں نے اخلاق، سیاست اور معاشرت غرض کے زندگی

کے ہر پہلو پر شرح و بسط کے ساتھ بے باک اور پُر لطف انداز میں نکتہ چینی کی ہے۔ معاشرے کے نکتہ چیں اور مصلح کی حیثیت سے ان کی عظمت مسلم ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھیے:

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی
اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہے وہ لیزی اور ناچنے میں ریڈی

☆☆☆☆

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کر لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر نے اپنے اشعار میں انگریزی الفاظ بھی بلاتکلف استعمال کر کے ان سے مزاح پیدا کیا ہے۔ دراصل اکبر ہی کے طفیل اُردو کی مزاحیہ شاعری کو رتبہ حاصل ہوا ہے اور دوسرے شعراء بھی اس جانب متوجہ ہوئے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے'' اس حوالے سے ایک اہم کتاب ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے کئی اہم شعراء کی ظریفانہ شاعری پر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنی اس کتاب کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''سنجیدہ شاعری کی طرح ظریفانہ شاعری سے بھی مجھے دلچسپی رہی، سُننے کا شوق رہا اور کہنے کا بھی، ۱۹۴۹ء تک الٰہ آباد، کانپور، فتح پور، لکھنؤ،

سلطان پور اور اناؤ وغیرہ کے مشاعروں میں جہاں مجھے بڑے بڑے سنجیدہ شعراء کو سننے کا موقع ملا وہیں ظرافت نگاروں کے کلام سے لطف اٹھانے کی صورتیں بھی مہیا رہیں۔ چنانچہ، بہت سے اشعار ذہن میں محفوظ ہو گئے اور آج بھی محفوظ ہیں۔ مثلاً بے تک الہٰ آبادی کا یہ شعر

یہ ٹھانی ہے کہ فوراً عقد کر کے زہر کھا لوں گا
بلا سے جان جائے اُن کو بیوہ کر کے چھوڑوں گا

ایک شعر ایک اور مزاح نگار کا سنیے

واہ رے محبوب کتنی دلکشی کانے میں ہے
دونوں عالم کی حقیقت ایک پیمانے میں ہے

مجھے کئی حوالوں سے مزاحیہ شاعری سے دلچسپی رہی ہے اس دلچسپی نے مضمون لکھوائے ہیں اور اس دلچسپی نے یہ کتاب بھی مرتب کروائی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے'' کا پہلا مضمون اکبر الہ آبادی کی ظرافت نگاری کے بارے میں ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:

''وہ اُردو کے تنہا شاعر ہیں جن کی شاعری ظرافت کے جملہ اقسام پر محیط ہے۔ طنز و مزاح ہجو ملیح، کنایہ، رمز، بذلہ سنجی، لطیفہ، چٹکلہ، اور پیروڈی غرض کہ ظرافت نگاری کی جتنی ممکن صورتیں ہو سکتیں ہیں سب ان کے یہاں ملتی ہیں اور اس درجہ مؤثر و دلکش پیرائے میں کہ اُردو شاعری میں نہ اُن سے پہلے اس کی نظیر ملتی ہے اور نہ اُن کے بعد'' صفحہ نمبر ۱۵

نمونہ کلام:

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

☆☆☆☆

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اکبر کی ہمہ گیری ظرافت کی مختلف نوعیتوں کو خوش اسلوبی سے برتنے تک محدود نہیں ہے بلکہ مواد کی کثرت اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے بھی اس میدان میں اُن کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ معاشرت، مذہب، سیاست، قیادت، تعلیم، حکومت، تہذیب اور اخلاق کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ شیخ، واعظ، مرزا، جمن، کلو، بدھو، رمضانی، مولوی، ممن، ہرچرن داس، گاندھی جی اور کرزن مہاراج سبھی ان کے دائرہ ظرافت میں داخل ہیں۔ اکبر نے سر سید پر جس جس انداز سے اور جس کثرت سے اشعار کہے ہیں کسی اور پر نہیں کہے''۔ صفحہ نمبر ۱۵۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون میں اکبر کی ظریفانہ شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور نہایت عمدگی سے سر سید اور تحریک علی گڑھ کے بارے میں اکبر کے خیالات کو واضح کیا ہے اور ساتھ ہی اکبر کے سیاسی رجحانات کو بھی پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا دوسرا مضمون ''سید محمد جعفری کی ظریفانہ شاعری'' کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں اکبر کے بعد ظریفانہ شاعری میں اکبر کے طرز کا بڑا شاعر سید محمد جعفری ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید

''سید محمد جعفری کا مزاج سیاست کی بے اعتدالیوں اور معاشرتی ناہمواریوں کی مجموعی صورت سے جنم لیتا ہے۔ ان کا گہرا مشاہدہ موضوع کے باطن سے ناہمواری کو تلاش کرتا ہے اور اس کی ۔۔۔۔ صورت خندہ خیالی سے آشکار کر دیتا ہے''۔

صفحہ نمبر ۵۹۵ ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ''

سید محمد جعفری کا دائرہ طنز و ظرافت نہ صرف یہ کہ بہ اعتبارِ موضوع اکبر کی طرح رنگا رنگ اور وسیع ہے بلکہ اس کا اسلوب اور فنکارانہ طرزِ عمل بھی اکبر سے بہت مماثل ہے جدید مغربی تمدن اور نئی صنعتی اقدار اور تہذیب کے جن مضر و مضحک پہلوؤں کو اکبر نے طنز کا نشانہ بنایا ہے عام طور پر سید محمد جعفری نے بھی مشرق سے دلدارگی و شیفتگی کے سبب اُن ہی پہلوؤں پر توجہ صرف کی ہے۔ سید محمد جعفری کے طنز و ظرافت میں جن بے اعتدالیوں نے جگہ پائی ہے اُن کا تعلق بیسویں صدی کے سماجی و تہذیبی رویوں سے ہے''۔

صفحہ نمبر ۳۱

نمونۂ کلام:

یُو۔ این۔ او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے
وعدۂ فردا پر ٹرخانے کے فن میں فرد ہے
ڈالیے اس کے گزشتہ کارناموں پر نظر
وادیٔ کشمیر کے قبضے کو ٹالا کس قدر

صفحہ نمبر ۴۲

سید محمد جعفری کو مصوری سے فطری لگاؤ تھا جس کا اثر اُن کے اشعار میں نظر آتا ہے مثلاً

نقشِ محبوب مُصور نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

☆☆☆☆

بولی تصویر جو میں نے اُسے اُلٹا پلٹا
میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

صفحہ نمبر ۴۶

اساتذہ فن نے اصطلاحی طور پر طنز و مزاح کی جتنی صورتیں بتائی ہیں وہ سب سید محمد جعفری کے یہاں نظر آتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری

''سید محمد جعفری کی زبان و بیان کی پختگی و چاشنی کے ساتھ بہ اعتبارِ

موضوع جو ایک طرح کی جامعیت اور ہمہ جہتی نظر آتی ہے اور جس
کے سبب اُن کی شاعری کا کینوس اُن کے ہم عصر مزاح نگار شعراء کے
مقابلے میں زیادہ رنگین و وسیع ہوگیا ہے۔ صفحہ نمبر ۳۲

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا تیسرا مضمون ''شیخ نذیر احمد طنز و مزاح کے شاعرِ بے نظیر'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں آپ لکھتے ہیں:

''شیخ نذیر نے آج کی صنعتی اور اس کے پیدا کردہ تہذیبی مسائل کو طنز و
مزاح کے پیرائے میں موضوعِ سخن بنایا ہے اور کسی مخصوص ہیئت میں
نہیں بلکہ ہر صنفِ سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے، لیکن ان کی ظریفانہ
شاعری میں جو چیزیں انفرادیت کی شان پیدا کرتی ہیں وہ پیروڈی اور
لمرک ہیں۔ صفحہ نمبر ۴۹

شیخ نذیر احمد نے اُردو کے ممتاز شعراء مثلاً علامہ محمد اقبال، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور حفیظ جالندھری وغیرہ کے کلام کو پیشِ نظر رکھ کر پیروڈی کے نام سے طنز و ظرافت کے نہایت عمدہ پھول کھلانے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار دیکھتے چلئے:

حُسن کہتا تھا جنابِ عشق اب شادی کرو
عشق کہتا تھا کہ شادی کی مصیبت سے ڈرو
تنگ آکر حُسن بولا ہائے ہائے
کیا ضروری ہے کہ جس دم موت آئے
اپنے والد کی طرح تم بھی کنوارے ہی مرو

ص ۵۷

لمرک کی عمدہ مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی کی اس صنف کو شیخ نذیر نے بہت عمدگی سے برتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''نذیر احمد شیخ کی طنز و مزاح کی منفرد طبع اور مختلف النوع شخصیت تھے، اُنہوں نے صورتِ واقعہ سے خالص مزاح پیدا کیا ہے''۔

(صفحہ نمبر ۵۹۷، ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا چوتھا مضمون شہباز امروہوی کی ظریفانہ شاعری کے بارے میں ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:

''شہباز امروہوی زبان و بیان پر پوری طرح قادر بھی ہیں اور تہذیبی روایت کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ نتیجتاً معاشرے کی شاید ہی کوئی ایسی ناہمواری یا اخلاقی کمزوری ہوگی جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو اور جسے انہوں نے اپنی مزاحیہ شاعری میں چابک دستی و قادر الکلامی کے ساتھ جگہ نہ دی ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے اُن کا دل زندگی کی ہر بے اعتدالی و بدعنوانی پر کڑھتا ہے۔ جب یہ کڑھن اپنے نکاس کی کوئی صورت نہیں پاتی تو چار و ناچار اپنے اُوپر طنز و مزاح کا لطیف پردہ ڈال لیتی ہے۔ یہ لطیف پردہ دوسروں کا دل تو خوش کر دیتا ہے۔ لیکن خود شاعر اپنے کربِ روحانی کو چھپانے کی کوشش میں اندر سے اور دُکھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طنز و مزاح کے نکات کے سلسلے میں اس خاص پہلو کا ادراک و احساس کا قہقہہ دراصل دل شکستگی کا پردہ ہے، جس کا احساس شہباز

امروہوی کو بھی ہے۔ انہوں نے اس امر کے اعتراف وانکشاف کے لئے کہ ان کی شاعری لطیف ونشاط کی شاعری نہیں حقیقتاً غم واندوہ کی شاعری ہے پورا ایک باب باندھا ہے''۔ صفحہ نمبر ۔۵۹۔

مثلاً چند اشعار دیکھتے چلیے:

یہ قہقہے نہیں شہباز میرے نالے ہیں
بہاؤ یا ہوں میں آنسو ہنسی کے پردے میں

شہباز قہقہوں کو مرے سرسری نہ جان
درد ان میں دل کا میں نے بھرا ہے سمیٹ کر

صفحہ نمبر ۶۰

شہباز امروہوی کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے آمریت وجبریت، کینہ پروری، مذہبی تعصب، حکومت وسیاست گویا ہر قسم کی ناانصافیوں کا نہایت عمدگی سے پردہ چاک کیا ہے۔

نمونہ کلام:

ایک لڑکی کو جو دیکھا ایک دن پڑھتے ہوئے
سنسنی سی ہوگئی پیدا میرے ایمان میں
کیا کہوں شہباز کیا منظر نظر آیا مجھے
ناولیں تھیں میز پر قرآن تھا جزدان میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب میں شہباز امروہوی کی شاعری کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ فرمان صاحب کی کتاب کا پانچواں مضمون سید ضمیر جعفری کی ظریفانہ شاعری سے متعلق ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:

''ضمیر جعفری اپنی شاعری میں لفاظی یا لفظوں کی شعبدہ گری سے ظرافت کو جنم نہیں دیتے، بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی واقعے یا صورتِ حال کے کمزور اور قبیح پہلوؤں کا ندرتِ خیال کی مدد سے سنجیدہ الفاظ میں ایسا خاکہ کھینچا جائے کہ وہ قاری یا سامع کے حق میں لطف انگیز اور خوش گوار بن جائے، انہیں اپنی اس کوشش میں اکثر جگہ کامیابی ہوئی ہے، کہیں کہیں انہوں نے لفظوں کی مدد سے بھی مزاح کا پہلو پیدا کیا ہے''۔ صفحہ نمبر ٦٦۔

نمونہ کلام:

وہ سب کو تھوڑا تھوڑا شربت دیدار دیتے ہیں
مگر مصروف ہیں اتوار کے اتوار دیتے ہیں

صفحہ نمبر ٢٧

اس کا بھی فیصلہ کرے کوئی
کس سے کتنی حیا کرے کوئی

بقول ڈاکٹر انور سدید

''سید ضمیر جعفری کے ہاں زندگی کو اعتنا کی نظر سے دیکھنے اور مزاح سے اس کی کایا پلٹنے کا انداز نمایاں ہے۔ انہوں نے انگریزی مزاح کو

بڑی لطافت سے اُردو نظم کا روپ دیا ہے"۔

(ص ۵۹۶، اُردو ادب کی مختصر تاریخ")

ضمیر جعفری نے جو کچھ کہا ہے معتبر پاکیزہ اور سنجیدہ زبان میں کہا ہے۔ لفظی شعبدہ گری سے کام نہیں لیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اُردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے" کا چھٹا مضمون مرزا محمود سرحدی کی ظریفانہ شاعری سے متعلق ہے جس میں آپ لکھتے ہیں

"مرزا محمود نے ایک نہایت شائستہ و مہذب اور باخبر و باشعور شہری کی طرح پاکستانی معاشرے پر مبصرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ معاشرے نے جتنی کروٹیں بدلی ہیں ان سب کو کسی نہ کسی طور پر شعر کا موضوع بنایا ہے۔ اُنہوں نے ڈھکوسلے کی شاعری نہیں کی۔ یعنی بے تکے الفاظ یا بے ڈھنگے قوافی کے ذریعے شاعری کو بلاوجہ مزاحیہ نہیں بنایا۔ طنز کی وہ تلخی اور ناہمواری بھی ان کے یہاں داخل نہیں ہونے پائی جو مزاحیہ شاعری کو کم مرتبہ کر دیتی ہے"۔ صفحہ نمبر ۸۲

نمونۂ کلام

کمائی سے رشوت کی یہ سب بنے ہیں
مکاں جن پر لکھا ہے "من فضلِ ربی"

☆☆☆☆

جب وہ پہلے ملی تو چُپ چُپ تھی
اور میں تھا کہ بولے جاتا تھا

وہ دوبارہ ملی تو میں چُپ تھا
اور اُسے بولنے کا چسکا تھا
ہوئی شادی تو دونوں چُپ چُپ تھے
بولنے والا صرف ملا تھا
پھر یہ عالم تھا دونوں بولتے تھے
اور سارا محلّہ سنتا تھا

صفحہ نمبر ۷۷

مرزا محمود سرحدی نے معاشرتی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اور معاشرتی کجی کو اصلاحی انداز سے درست کرنے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی اُنہوں نے رعایتِ لفظی کا سہارا بھی لیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہایت عمدگی سے محمود سرحدی کی شاعری کا جائزہ ادب کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اسی کتاب کا ساتواں مضمون ڈاکٹر انعام احسن حریف کی ظریفانہ شاعری کے بارے میں ہے۔ جس میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''انعام احسن کی شاعری خواہ نظم و غزل کی ہیئت میں ہو یا قطعات و رُباعیات کی صورت میں، شوخی و مزاح کی پاکیزہ حدود میں رہتی ہے۔ زہر خند یا طنز دل آزاری کی مثالیں ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کی شاعری بحیثیت مجموعی دل بہلاوے اور خوش طبعی کی شاعری ہے کہیں کہیں طعن و طنز کا تیر اُن کے یہاں چلتا ہے لیکن وہ

جان لیوا نہیں بلکہ لطف انگیز چبھن کا باعث ہوتا ہے''۔

صفحہ نمبر ۹۰

نمونہ کلام:

جب کبھی موڈ میں وہ آتے ہیں
کس تکلف سے گھر بلاتے ہیں
اور آنکھیں دکھا دکھا کے مجھے
نرگسی کوفتے کھلاتے ہیں

صفحہ نمبر ۸۵

ڈاکٹر انعام احسن ظریف نے رُباعیات اور قطعات میں نہایت عمدگی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

آٹھواں مضمون ظریف لکھنوی کی ظرافت نگاری سے متعلق ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ظریف لکھنوی کا ایک خاص کمال یہ ہے کہ انہوں نے اودھ کی مقامی بولی اور دیہاتیوں کی زبان کا بہت خوبصورت مصرف کیا ہے۔ جس موقع کی تصویر کھینچی ہے اور جس پیشے اور مرتبے کے افراد کے منظوم مکالمات قلم بند کئے ہیں اُنہی کے ماحول اور طرزِ کلام کو ہُو بہُو اپنا لیا یقیناً اُن کی اس قادرالکلامی اور ایجاد سے اُن کا رنگ شاعری دوسرے ظرافت نگاروں سے الگ اور منفرد ہو گیا ہے''۔ صفحہ نمبر ۹۲

نمونۂ کلام:

مقبول جب وطن سے سوئے کربلا چلے
ہمراہ سب عزیز چلے آشنا چلے
کچھ لوگ ساتھ کان میں پڑھ کر دُعا چلے
خواہش کسی کی یہ تھی کہ ساتھ چلا چلے
پہنچے جو ریل گھر پہ بڑا ازدھام تھا
مائل معانقے پہ ہر اِک خاص و عام تھا
کچھ ریل گھر کا حال کروں مختصر بیاں
وہ نو بجے کا وقت وہ ہنگامے کا سماں
قلیوں کا لاد لاد کے لانا وہ پیٹیاں
بجنا وہ گھنٹیوں کا وہ انجن کی سیٹیاں
گڑبڑ مسافروں کی بھی ایک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

صفحہ نمبر ۹۶

جو لوگ اودھ کی زبان سے ناواقف ہیں ان کے لئے ظریف لکھنوی کی شاعری سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا اگلا مضمون دلاور فگار کی ظریفانہ شاعری سے متعلق ہے۔ جس میں آپ لکھتے ہیں:

"دلاور فگار کے یہاں سماجی و تہذیبی شعور کے ساتھ وہ اصلاحی انداز نظر بھی تاک جھانک لگاتا ہے جو اکبر الہٰ آبادی کا طرہ امتیاز ہے۔ لیکن فگار کو معاشی و سماجی طور پر وہ سکون بخش ماحول میسر نہ آیا کہ وہ فکرِ معاش سے بے نیاز ہوکر پوری آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے۔ اُن کی شاعری فکر انگیز اور نشاط آور ہے۔ قاری کے حسِ مزاح کو مہمیز کرتی ہے۔ برائیوں کے خلاف احتجاج پر اُکساتی ہے اور شر کو خیر میں بدلنے کا لمحاتی حوصلہ دیتی ہے"۔ صفحہ نمبر ۹۹

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب میں احمق پھپھوندوی، فرقت کاکوروی، واہی نقوی، مسٹر دہلوی، راجا مہدی علی خاں اور آزر عسکری کی ظریفانہ شاعری کا بھی مختصراً جائزہ پیش کیا ہے۔ اُردو کی ظریفانہ شاعری کے حوالے سے فرمان صاحب کی یہ کتاب نہایت اہم ہے۔

مطبوعہ جریدہ "نفاذ اُردو" کراچی، دسمبر ۲۰۱۲ء

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' ایک مطالعہ

شاعری انسانی جذبات و احساسات کے لطیف اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک قسم کی حُسن کاری بھی ہے اور حُسن آفرینی بھی۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی ہے، احساسات کی حسین مصوری ہے۔ تخیل کا ایک رقصِ دل فریب ہے۔ جنتِ نگاہ بھی ہے اور فردوسِ گوش بھی۔ اس کا اثر دل و دماغ دونوں پر ہوتا ہے۔ وہ حواس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ وہ جذب و شوق کی ایک لغزشِ مستانہ ہے۔ عقل و شعور کا ایک حسین ارتعاش ہے۔ حسن و جمال کی ایک دل موہ لینے والی لطیف تھرتھراہٹ ہے''۔

حوالہ: شاعری کیا ہے؟ از ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ نمبر ۹

شاعری کی مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستانی معاشرے کا اُردو شاعری کے ساتھ بہت گہرا رشتہ ہے۔ فرمان صاحب کی یہ تصنیف جولائی ۱۹۹۰ء میں ''وکٹری بک بینک لاہور'' کے تحت شائع ہوئی، اس سلسلے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''شاعری کے تعلق سے اُردو کی رسائی صرف دنیا کے بڑے شہروں تک محدود نہیں بلکہ چھوٹے اور اوسط درجے کے شہروں تک یہ جانی

پہچانی جاتی ہے۔ یورپ اور عرب کے بعض ممالک کے ساتھ ساتھ انگلستان، کینیڈا اور امریکہ کے بعض بڑے شہر تو اُردو شاعری کا مرکز بن گئے ہیں"۔

یہ کتاب اپنی اہمیت کی بنا پر بار بار شائع ہوئی اس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ہی اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔

اُردو شاعری کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ یہ فارسی سے اُردو میں آئی اور بہت جلد مقبول ہوگئی۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اُردو شعراء نے اپنے مجاہدین کی ہمت افزائی نظمیں لکھ کر کی۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی اس سلسلے میں خوب اشعار کہے ان کا یہ شعر تو زبان زد عام ہوگیا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اُردو شاعری میں علامہ اقبال، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، احسان دانش، حبیب جالب اور کئی ایسے شعرا گزرے ہیں جنہوں نے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی حالات پر نہایت عمدہ نظمیں کہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب "اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" میں لکھتے ہیں:

"پاکستان کی ادبی تاریخ اُردو شاعری کا ایک روشن باب ہے۔ ایسا باب

جسے ہمیشہ قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ موقع کی مناسبت سے ان گنت، ملی نغمے، قومی ترانے، پُرسوز گیت، ولولہ انگیز نظمیں اور جنگ نامہ کے طرز پر رزم نامے لکھے گئے، شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے جہاد بالقلم میں حصہ نہ لیا ہو"۔ صفحہ نمبر ۳۲

چند اشعار دیکھئے:

سزا کے طور پر ہم کو ملا قفس جالب
بہت تھا شوق ہمیں آشیاں بنانے کا

(حبیب جالب)

منیر حسنِ باطنی کو دیکھتا نہیں
متاعِ چشم کھو گئی لباس کی تراش میں

(منیر نیازی)

ان اشعار کے الفاظ اپنے ماحول کی معاشرتی زندگی کو نہایت عمدگی سے پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف کا دوسرا مضمون "جوش ملیح آبادی اور ان کا تغزل" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

جوش فطری طور پر رومانی شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے عصری رجحانات اور تقاضوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، جوش کی شاعری میں طنز کے نشتر بھی ہیں اور بغاوت کا اظہار بھی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں سے لوگوں میں جذبۂ آزادی بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ڈاکٹر

فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''جوش غزل کے مزاج کے دشمن نہیں تھے، وہ معنی کی سطح پر غزل کو نظم جیسی وسعت اور نظم کو غزل جیسی اثر پذیری دینا چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اُن کا مزاج سراپا تغزل تھا۔ البتہ ان کے دل و دماغ میں اس تغزل کی لہریں اتنی دور رس، بلند آہنگ اور پُر خروش تھیں کہ غزل میں ان کی سمائی مشکل تھی اس لئے انہیں طویل نظموں کا سہارا لینا پڑا''۔ (صفحہ نمبر ۴۷)

جوش فرماتے ہیں:

قوم کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

اب اے خُدا عنایتِ بے جا سے فائدہ
مانوس ہوچکے ہیں غم جاوداں سے ہم

''اُردو شاعری اور پاکستان معاشرہ'' کا تیسرا مضمون ''فیض احمد فیض، نقشِ فریادی سے دستِ صبا تک'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیض کا مقام بہت بلند ہے وہ حقیقی انقلابی ہیں انہوں نے دار و رسن کی سختیاں برداشت کیں۔ اس کے باوجود ان کے اشعار میں نرمی اور محبت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ فیض اپنی شاعری میں سیاست کی

باتیں ادبی زبان میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں سیاسی پروپیگنڈہ نہیں بلکہ ادبی فضا پائی جاتی ہے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

""فیض کے یہاں مبہم ورمزیت اور بھٹکا دینے والی تصوریت یا محض لذت پرستانہ رومان پسندی اور عیش کوش، جمال پرستی کہیں نہیں ملتی"، "نقش فریادی، اور "دستِ صبا" میں یہ چیز بھی ہے کہ فیض کے فکر وفن کا دامن بہت مضبوط ہوگیا ہے۔ ان کی فنی دسترس نظم تک محدود نہیں بلکہ قطعات، آزاد نظمیں اور غزلیں سب کی سب اس کے فنی، تصرف میں ہیں۔ "دستِ صبا" میں اگرچہ صرف سولہ سترہ غزلیں ہیں لیکن سب اپنا منفرد اسلوب رکھتی ہیں"۔ (صفحہ نمبر ۶۵)

فیض کہتے ہیں:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شب غم گزار کے
دنیا نے تری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

"اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" اس کتاب کا چوتھا مضمون "ادا جعفری آج کی شاعری کا ایک معتبر نام" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ ادا جعفری ایک فطری شاعرہ ہیں ان کے اشعار میں سادگی، صفائی اور روانی بھرپور

انداز میں پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں پختگی اور تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ واردات قلبی اور احساسات کا اظہار نہایت شگفتہ انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کی نظمیں ان کے سیاسی اور معاشرتی شعور کی آئینہ دار اور حُب الوطنی کی ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''ادا جعفری نے ایک خاتون کی حیثیت سے نسائیت کے بعض ایسے جذبوں کی ترجمانی بھی کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہ تھا لیکن وہ اس دائرے میں گھر کر نہیں رہ گئیں بلکہ نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر اور ذات کے حصار سے باہر نکل کر عام انسانی فضائے حیات اور مسائل کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس خوبصورتی اور تواتر کے ساتھ کہ ان کا شمار آج کے صفِ اوّل کے شعراء میں کیا جاتا ہے۔ حسنِ خیال، حسنِ عمل اور حسن آفرینی و حسن کاری ان کی طبیعت کا انفرادی نشان اور ان کے تخلیقی مزاج کی شناخت ہیں''۔

(صفحہ نمبر ۸۹)

ادا جعفری فرماتی ہیں

ان گنت سانسوں کی اُلجھی ہُوئی زنجیروں میں
زندگی ہے کہ جکڑتی ہی چلی جاتی ہے
بجھ کے رہتی بھی نہیں اور بھڑکتی بھی نہیں
آگ سی ہے کہ سُلگتی ہی چلی جاتی ہے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا پانچواں مضمون ''صبا اکبر آبادی اور دستِ زرفشاں'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ صبا اکبر آبادی اُردو اور فارسی پر مہارت رکھنے والے شاعر تھے۔ ترجمہ کے فن پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی انہوں نے عمر خیام کی رُباعیات کو خوبصورت اور دلکش انداز میں اُردو رُباعیات کا روپ عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''صبا اکبر آبادی اُردو کے اُن بزرگ شاعروں میں سے ہیں جو محض شاعر نہیں ہیں بلکہ شاعر کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی اُن کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہے۔ مسلسل مطالعے کے ذریعے انہیں معلوم ہے کہ شاعری کارِ پیغامبری ہو کر بھی وحی والہام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ فن کدۂ حیات میں یہ چراغ سے چراغ اور خیال سے خیال روشن کرنے کا ایک عمل ہے۔ اس عمل میں ایک شاعر اخذ و اکتساب اور مشاہدہ ومطالعہ کی مدد سے اپنے فکر و خیال کو جس نسبت سے روشن وتوانا بنائے رکھتا ہے اس نسبت سے اس کی شاعری جاندار و تابناک ہوتی ہے۔ چنانچہ صبا اکبر آبادی نے مسلسل مطالعہ کے ذریعے اپنی دنیائے خیال کو منور رکھا''۔ صفحہ نمبر ۹۵

نمونۂ کلام دیکھئے

کہتے ہیں کہ جو یہاں پہ جیسا ہوگا
ویسا ہی اُسے حشر میں اُٹھنا ہوگا

یوں رہتا ہوں ہر دم ے و محبوب کے ساتھ
اُن کے ہمراہ حشر اپنا ہوگا

مدھم ہے ہوا پھول ہیں نیلے نیلے
بارش سے شجر ہوئے ہیں گیلے گیلے

بُلبُل سرِ شاخِ گُل صدا دیتی ہے
کہتی ہے کہ ہاں وقت ہے پی لے پی لے

اس کتاب کا چھٹا مضمون ''ماہر القادری کی غزل گوئی'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے ماہر القادری کا شمار ادبی و تنقیدی مضمون نگار، افسانہ اور ناول نویس، اداریہ نویس، نعت و غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی خوش گلوئی کی بدولت بھی شہرت پائی اپنی نعتیں اس ترنم سے پیش کرتے کہ سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''مولانا بنیادی طور پر غزل اور صرف غزل کے شاعر تھے۔ تغزل سے ان کے مزاج کو خاص مناسبت تھی۔ اشعار میں فکر و خیال کی زیادہ بلندی یا گہرائی نہ سہی، لیکن زبان و بیان میں ایسا والہانہ پن ہے کہ ان کی غزل قاری اور سامع کو چونکائے بغیر نہیں رہتی''۔ صفحہ نمبر ۱۰۰

نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہے:

پینے کی دیر ہے نہ پلانے کی دیر ہے
ساقی کے بس نگاہ اُٹھانے کی دیر ہے
جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار
سب آچکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے

کتاب ''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا ساتواں مضمون ''سلیم احمد کی بیاض پر ایک نظر'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ سلیم احمد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی ''تاریخ جدید اُردو غزل'' میں لکھتے ہیں:

''سلیم احمد کی غزل سائنسی عقلیت سے ذہنی موانست کا پتہ دیتی ہے اس میں بیرونی دنیا کے تضادات اور باطن کی کشمکش ہے۔ سلیم احمد کی فکر کا مرکزی نشان یہ ہے کہ انسان ماحول کے علاوہ اپنے وجود سے مطابقت کی جستجو کرے''۔ (صفحہ نمبر ۹۲۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''سلیم احمد کے شاعرانہ لب ولہجہ کو ہماری شاعری کے عمومی لب ولہجہ سے یکسر الگ کر دیتی ہے۔ بہت ممکن ہے سر دست یہ لب ولہجہ سکہ رائج الوقت کا کام نہ دے سکے۔ لیکن اس کے کھرے اور سچے ہونے سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور اسی لئے اگر اسے اُردو شاعری کے لب ولہجہ کا مستقل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا''۔

نمونۂ کلام دیکھئے

حالِ دل کون سنائے اسے ہمت کس کو
سب کو اس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے
حُسن چاہے جسے ہنس بول کے اپنا کر لے
دل نے اپنوں کو بھی بیگانہ بنا رکھا ہے

"اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" اس کتاب کا آٹھواں مضمون "جمیل الدین عالی کی دوہا نگاری" کے عنوان سے ہے۔ جمیل الدین کے دوہوں اور گیتوں نے بہت شہرت پائی لیکن ان کی غزلیں اپنی مثال آپ ہیں جن میں جذبۂ سوز دروں کی کارفرمائی اپنے عروج پر ہے۔ عالی جی زندگی کی حقیقتوں کے شاعر ہیں اسی لئے وہ اپنی غزلوں میں لطافتِ احساس اور حُسن آفرینی سے کام لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں مٹھاس اور ترنم پایا جاتا ہے دوہا نگاری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"جمیل الدین عالی اُردو شاعری کی تاریخ کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے دوہا کی صنف کو رتبۂ اعتبار بخشا اس کی حیثیت کو مستحکم کیا اور قولِ عالم کے درجے تک پہنچا کہ اپنی شناخت کا نشان بھی بنا لیا۔ عالی نے صرف یہی نہیں کہ دوہے کو شعوری طور پر اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا بلکہ انہوں نے دوہا پڑھنے کا ایک خاص انداز بھی ایجاد کیا"۔

"شاعر لکھنوی، لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر" کے عنوان سے کتاب کا

نواں مضمون ہے۔ شاعر لکھنوی کا شمار اپنے عہد کے معروف شعراء میں ہوتا ہے اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''شاعر لکھنوی واضح طور پر زندگی کی مثبت قدروں اور قدروں کی تزئین وتعمیر کے شاعر ہیں۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہو یا نہ رہا ہو اور انہوں نے اس تحریک سے وابستہ شعرا کا شعوری طور پر اثر قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن لاشعوری طور پر اس تحریک کے اس خاص مقصد سے جس کا تعلق ظالم اور طاقتور کے مقابلے میں مجبور اور کمزور کی حمایت سے ہے۔ ان کا ذہن اور کلام پوری طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک مصرعہ بھی گل وبلبل کی شاعری یا فن برائے فن کے ضمن میں نہیں آتا۔ تفریحِ طبع اور دل بہلاوے کیلئے انہوں نے کبھی شعر نہیں کہے بلکہ زندگی کی طرح شاعری کے باب میں بھی ان کا رول ہمیشہ سنجیدہ بامقصد اور تعمیری رہا ہے''۔

چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

انہیں کے نام سے منسوب ہے بہارِ چمن
جو لوگ واقفِ آدابِ رنگ و بو بھی نہیں

نظر اُٹھنا بھی بندگی ہے نظر جُھکنا بھی ہے عبادت
ہے ایک وہ بھی مقامِ سجدہ جہاں جبیں ہے نہ آستانہ

عشق کی شریعت میں وصل اور جُدائی کیا
ایک ہی سا عالم ہے قید کیا رہائی کیا

شاعر لکھنوی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے جبر، سماجی و سیاسی ناانصافی مظلوم کی دادرسی پر ان کا دل تڑپ اُٹھا ہے اور انہوں نے اپنے اشعار میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا دسواں مضمون ''منیر نیازی جدید تر لہجے کا پیامی'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

منیز نیاری نے اپنے عہد کے درد و کرب کو بڑے عمدہ انداز میں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ سماجی حالات محرومیاں اور خواہشات کو سچائی کے ساتھ پیش کرنے میں منیر نیازی بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ مثلاً کیا خوب کہا

میری صدا ہوا میں بہت دور تک گئی
پر میں بلا رہا تھا جسے بے خبر رہا

☆☆☆☆

دشمنی رسمِ جہاں ہے دوستی حرفِ غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''منیر نیازی کی شاعری جدیدیت'' کے بعض رُخوں کی حامل ہوتے ہوئے بھی زندگی کے منفی روّیوں کی شاعری نہیں ہے۔۔۔ گویا منیر نیازی کی شاعری کا تعلق جدیدیت کے ایسے طرزِ احساس سے ہے جو

آج کی زندگی اور اس کے اقدار کی نفی کرنے والے محرکات اور ان کی شدت و جبریت کو اہمیت تو دیتا ہے لیکن یہ طرزِ احساس اس قسم کا اندھا کنواں نہیں ہے جو روشنی اور ہوا سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگیا ہو۔ اس محرومی سے بچ نکلنے کا سبب وجودیت پرستوں کے عقیدے کے برعکس منیر نیازی کی اپنی ذات سے ماورا ایک ایسی مخفی قوت کا عقیدہ ہے جو مصائب کے بعد انسان کو بشارت کی ضمانت دیتا ہے یاس کے اندھیرے میں امید کی چاندنی چٹکاتا ہے اور زندگی کی معنویت کو تازہ معنویت عطا کرتا ہے''۔

دو شعر ملاحظہ کیجئے

منیر حُسنِ باطنی کو کوئی دیکھتا نہیں
متاعِ چشم کھو گئی لباس کی تراش میں

زمین دُور سے تارا دکھائی دیتی ہے
رُکا ہے اس پہ قمر چشمِ سیر بیں کی طرح

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا آٹھواں مضمون قابل اجمیری کا ''دیدۂ بیدار'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے ایجاز واختصار اور رمز و ایما اس کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن اس میں غمِ جاناں اور غمِ روزگار کے مضمون بھی جگہ پاتے ہیں۔ آرائش خم کاکل کا ذکر ہو یا اندیشہ ہائے دور دراز کا یہ سب کیلئے اپنا دامن کشادہ کر دیتی ہے۔ اس میں صرف قافیہ پیمائی نہیں ہوتی بلکہ معنی آفرینی

بھی موجود ہوتی ہے۔ صرف حسن و عشق کے افسانے نہیں سنائے جاتے بلکہ حقائق کا انکشاف بھی بڑی عمدگی سے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قابل اجمیری نے غزل سے گہرا رشتہ قائم کیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے اپنے دل کی باتیں اشعار کے ذریعے قارئین کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''قابل اجمیری کی طبیعت کو غزل سے خاص مناسبت ہے، وہ غزل کی نزاکتوں سے واقف ہیں اور ان نزاکتوں کو سلیقے سے برتنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں خیال کی ندرت ہے، فن کا جادو ہے فکر کی تازگی ہے، زبان کا حسن ہے، بیان کی لطافت ہے اسلوب کی دلکشی ہے اور جسم و روح میں ارتعاش پیدا کرنے دینے والی رعنائی ہے۔ ایسی رعنائی اور دلکشی جو تیس سال کی عمر میں دنیا کے گنے چنے شاعروں کو نصیب ہوتی ہے''۔

چند اشعار دیکھئے:

ہر قدم پر حادثہ ہر آرزو بھی حادثہ
حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے

☆☆☆☆

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

☆☆☆☆

حیرتوں کے سلسلے سوز نہاں تک آ گئے

ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا نواں مضمون سرشار صدیقی ''پتھر کی لکیر کے آئینے میں'' کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔ سرشار صدیقی کا شمار عہدِ حاضر کے اہم شعراء میں ہوتا ہے انہوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کی نظموں کا خزانہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''پتھر کی لکیر'' اُن کا اہم شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے پر تبصرے کرتے ہوئے اور سرشار صدیقی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''سرشار صدیقی کے شاعرانہ لب و لہجہ میں جرأت اظہار کے ساتھ ایک اور چیز نمایاں ہے اور وہ ہے ہماری سماجی و تہذیبی کمزوریوں پر ان کا طنز، ظرافت و شوخی یا مزاح و تمسخر کے ایسے اسالیب جن کا مقصود و حاصل دل کے بہلاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن ادبی طنز کا وہ اسلوب جو اخلاقی یا سماجی اصلاح و تعمیر کا فرض بھی انجام دیتا ہو۔ بہت کم نظر آتا ہے۔ سرشار نے اس اندازِ طنز کو اپنانے اور اسے نبھانے کی کوشش کی ہے اور یہی کوشش ان کے شاعرانہ لب و لہجے کا امتیازی نشان بن گئی ہے۔ سرشار کے طنز کی دنیا محدود نہیں۔ بہت وسیع ہے۔

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' اس کتاب میں ''عبدالعزیز خالد کی نعتیہ شاعری'' کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون بھی بے مثال ہے جس میں

عبدالعزیز خالد کے کئی شعری مجموعوں پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ عبدالعزیز خالد نے قصیدہ، رُباعی اور نظم کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اُردو کے ساتھ ساتھ شاعر نے عربی الفاظ اور فقرے بھی اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں جن سے ان کی مختلف زبانوں پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''عربی آمیز اُردو کی ثقالت کا ناخوشگوار اثر خالد کی شاعری پر یہ ہوا ہے کہ ان کے یہاں خیال کے مقابلے میں زبان کی سطح زیادہ بلند ہوگئی ہے بلکہ کہیں کہیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر معمولی اور ادنیٰ خیالات کے لئے اعلیٰ درجہ کے پُر شکوہ فقرے اور تراکیب ضائع کر رہا ہے'' صفحہ ۱۹۴

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا ایک مضمون ''اقبال حُسین شوقی کی رباعیاں'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے رُباعی اصنافِ سخن میں اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس کے تیسرے مصرعے میں قافیہ لانا اختیاری اور پہلے دوسرے اور چوتھے مصرے میں قافیہ کا استعمال لازمی ہے۔ رُباعی اپنے مخصوص وزن کے سواء کسی اور وزن میں نہیں کہی جاسکتی۔ جن بزرگ شعراء نے رُباعی کی جانب بھرپور توجہ دی ہے ان میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور امجد حیدر آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چند دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ اقبال حُسین شوقی نے اس سلسلہ میں خاصا کام کیا ہے اور بہت عمدہ رُباعیات اُن کے یہاں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال شوقی کی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ فطرت نے زندگی کو کسی ایک گوشے سے نہیں ہر گوشے سے دیکھا ہے۔ کسی ایک پہلو پر نہیں ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور اس وسعتِ نظر کے نشانات ان کی رُباعیوں میں ہر جگہ صاف نظر آتے ہیں۔ اقبال شوقی کی رُباعیات کا لہجہ کہیں کہیں جوش کے لہجہ سے بھی ہم رنگ نظر آتا ہے۔ یہ ہم رنگی رندانہ مضامین کے بیان میں خصوصیت سے اُبھر آتی ہے''۔

(صفحہ۲۰۱،۲۰۵)

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے

ہر پھول کی شوخی پہ مچل جاتا ہے
ہر شمع کی گرمی سے پگھل جاتا ہے
یہ حال ہے حسرتِ سکوں میں دل کا
دشمن کی بھی صحبت میں بہل جاتا ہے

☆☆☆☆

مسکن ہے کہ کاشانہ ہے معلوم تو ہو؟
بستی ہے کہ ویرانہ ہے معلوم تو ہو؟
صورت تو کوئی اُبھر کے آئے کہ یہ دل
کعبہ ہے کہ بتخانہ ہے معلوم تو ہو؟

اقبال حسین شوقی نے اپنے مشاہدات و تجربات کو محض جذباتی انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ شاعرانہ دلکشی کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی رُباعیات زندگی

کے مسائل پر ناقدانہ انداز سے نگاہ ڈالتی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف "اُردو شاعری اور پاکستان معاشرہ" میں انجم اعظمی کے "لہو کے چراغ" کی روشنی میں، کے عنوان سے بہت عمدہ مضمون بھی شامل ہے۔ "لہو کے چراغ" کے عنوان سے انجم اعظمی کا یہ مجموعۂ کلام کراچی آرٹ اکیڈمی نے شائع کیا ہے جس سے انجم اعظمی کے فکر وفن پر روشنی پڑتی ہے انجم اعظمی کا یہ مجموعہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ کلام سادگی اور روانی اور دلکشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ شاعر نے جو کچھ محسوس کیا ہے اُسے نہایت سادگی اور سچائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ نظموں میں بھی خیالات کی فراوانی ہے جس میں بناوٹ نام کو نہیں۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح لکھتے ہیں:

"انجم کی شاعری بھی اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرح ایک فرد کی شاعری ہے۔ اس کی شاعری فرد کی شاعری ہوتے ہوئے بھی اپنے معاشرے اور قومی و ملی زندگی سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ انجم نے اپنی شاعری کیلئے خام مواد اپنے گرد و پیش ہی سے حاصل کیا ہے اور اس کے جذبات و خیالات اور افکار و مزاج میں اسی وجہ سے قومی و ملی روح ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے"۔

انجم اعظمی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری مزید لکھتے ہیں:

"اس کے اشعار میں عظمتِ آدم، سعیِ پیہم کی پرستش، مہ و انجم کی ٹھنڈی چھاؤں، نشاطِ آگہی، لیلیٰ گیتی، سفرِ کہکشاں درِ کہکشاں اور جرسِ

کارواں درکارواں کی گونج جس نغمگی و حلاوت اور حوصلۂ خیزی و رجائیت کے ساتھ سنائی دے رہی ہے وہی دراصل انجم کی شاعری کی لے متعین کرتی ہے"۔ (صفحہ نمبر ۲۲۵)

اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" اس کتاب کا اگلا مضمون "صادقینِ شاعری و مصوری کا مرج البحرین" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ صادقینِ عالمی شہرت کے مصور و خطاط ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے خاص طور پر رُباعیات سے انہیں دلچسپی تھی اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"صادقین کی رُباعیوں اور ان کے دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح وہ خطاطی و مصوری کے رموزِ فن اور اس کی علمی و فنی تاریخ سے واقفیت رکھتے تھے اسی طرح رُباعی کے وزن کی مشکلات اور نامور رُباعی نگاروں کے کمالات سے پوری طرح بہرہ مند تھے"۔

نمونہ کلام دیکھیے

قسمت نے مجھے پیش کیا تھا کیا کیا
رد کر کے مگر، میں نے لیا تھا کیا کیا
مجھ میں ہی تھی اکِ خوئے قناعت ورنہ
مولیٰ نے تو بندے کو دیا تھا کیا کیا

☆☆☆☆

عاشق کیلئے رنج و الم رکھے ہیں
شاہوں کے لئے تاج و علم رکھے ہیں

میرے لئے کیا چیز ہے میں نے پوچھا
آئی یہ صدا لوح و قلم رکھے ہیں

اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' کا اگلا مضمون جناب افتخار عارف کی شاعری سے متعلق ہے جسے ''آہنگ کی تلاش کا شاعر'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ بلاشبہ جناب افتخار عارف عہدِ حاضر کے مقبول شعراء میں شامل ہیں۔ غزلیں ہوں یا نظمیں اُنہوں نے اعلیٰ درجے کی شاعری پیش کی ہے۔ وہ خود اعلی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کا اپنا لہجہ ہے جس سے با آسانی ان کے اشعار کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''افتخار عارف کی شاعری محض جذبے کے ارتعاش اور احساس کی لرزش کی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ تامل و تفکر کے وہ عناصر بھی اُن کے یہاں ملتے ہیں جو مشاہدات سے آگے بڑھ کر گہرے مطالعے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ افتخار عارف کی شاعری میں جہاں ماضی کی زندہ اقدار و روایات کا احساس و شعور ملتا ہے وہیں حال کو تازہ تر امکانات سے منور و مزین کرنے کا سلیقہ بھی بہت نمایاں ہے''۔ (صفحہ نمبر ۲۳۵)

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

☆☆☆☆

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

☆☆☆☆

ندی چڑھی ہوئی تھی اور ہم بھی تھے موج میں
پانی اُتر گیا تو بہت ڈر لگا ہمیں

☆☆☆☆

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے

ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ افتخار عارف خوش فکر شاعر ہیں۔

کتاب اُردو شاعری اور پاکستان معاشرہ'' کا اگلا مضمون ''عطا شاد۔۔ شاعرِ شعلہ نژاد'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ عطا شاد کا قیام کوئٹہ میں ہے۔ ان کی شاعری میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ انہوں نے بڑی خوبی سے اپنے وطن کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے نظم اور غزل دونوں کو وسیلہ بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''عطا شاد بنیادی طور پر حرارت روشنی اور حرکت کے شاعر ہیں۔ حرارت نام ہے ان کے ذہن کی اُس سوچ کا جو ایک خاص ماحول میں دیر تک سانس لینے اور پروان چڑھنے کے سبب عطا شاد کی شاعری کا ایک طاقتور محرک بن گیا ہے۔ روشنی عطا شاد کی فکر و بصیرت اور

رجائیت و استقامتِ کردار کا دوسرا نام ہے۔ حرارت، ان کے مزاج کا وہ خاص عنصر ہے جو ان کے شعری لب ولہجہ کی علامت بن کر نمودار ہوا ہے"۔ (صفحہ نمبر ۲۴۷)

دراصل عطا شاد کے اشعار میں حسن و معنی کی تہہ داری پائی جاتی ہے۔ یہ تہہ داری سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ پُرکار ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:

دُھوپ کی تمازت تھی موم کے مکانوں پر
اور تم بھی لے آئے سائباں شیشے کا

☆☆☆☆

کس کو اس دور میں ہے فرصتِ عشق
آگ تیرے لب و رُخسار نے برسائی ہے

☆☆☆☆

سیلاب کو نہ روکیے رستہ بنایئے
کس نے کہا تھا گھر لبِ دریا بنایئے

☆☆☆☆

اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" اس کتاب کا اگلا مضمون "مُحسن بھوپالی کے نظمانے" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ محسن بھوپالی بنیادی طور پر حسن و رعنائی کے شاعر ہیں بقول ڈاکٹر وقار احمد رضوی:

"محسن بھوپالی کی غزلوں کی فکری اساس زیادہ گہری نہیں تاہم ان میں شاعرانہ تاثر ہے۔ اضطرابِ فکر ان کی غزلوں کا اہم پہلو ہے۔ ان کے

ہاں جستجو، ہجر و وصال، محبت نفرت کے موضوعات ہیں۔ انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے''۔

(صفحہ نمبر ۹۲۸۔ تاریخ جدید اُردو غزل)

محسن بھوپالی کے نظمانوں کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ان کے بیشتر نظمانوں میں ایسے واقعات و کردار کو جگہ دی گئی ہے جو بظاہر زندگی کے منفی اور غیر رجائی پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ محسن کے طرزِ احساس اور اسلوبِ سخن سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے منفی پہلوؤں کے ساتھ ان کا روّیہ مفاہمت اور ہم نوائی کا نہیں بلکہ طنز و تضحیک کا روّیہ ہے''۔ (صفحہ نمبر ۲۶۹)

یہ مضمون اپنی عمدگی اور صفائی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

''اشفاق حسین۔۔ اعتبار کا شاعر'' کے عنوان سے کتاب کا اگلا مضمون تحریر کیا گیا ہے۔

اشفاق حسین آزادی کے بعد کے شاعروں میں شامل ہیں غزل اور نظم دونوں اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک خیال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کی شاعری اسی عہد سے تعلق رکھتی ہے جو ان کا اپنا عہد

ہے۔ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے اور شعور کو پہنچے ہیں۔ اسی سرزمین کی کہانی ہے جس کی آب و ہوا، مٹی اور باغ و راغ سے ان کے دل و دماغ نے جلا پائی ہے۔ تہذیبی زندگی کی اسی شکست و ریخت اور سیاسی و سماجی زندگی کی اسی گھٹن کی آئینہ دار ہے جس میں شاعر سانس لے رہا ہے۔ جی رہا ہے جو اس عہد کا مقدر معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرزِ احساس اور سوچ کی ترجمان ہے جو اس کے آس پاس کی زندگی کے ردِ عمل کے طور پر اسے بخشی ہے" (صفحہ ۲۷۸)

نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

یوں غم سے نڈھال تو پہلے کبھی نہ تھے
ایسے شکستہ حال تو پہلے کبھی نہ تھے
کیوں جی رہے ہیں کس لئے جی رہے ہیں ہم
یہ ذہن میں سوال تو پہلے کبھی نہ تھے
عرصہ ہوا کہ یاد بھی تیری نہ آسکی
ہم اتنے بے خیال تو پہلے کبھی نہ تھے

اشفاق حسین نے عمدہ نظمیں بھی کہیں ہیں جن میں عزم و حوصلہ بھی بھرپور پایا جاتا ہے ملاحظہ کیجئے:

تم سمجھتے ہو
آنکھوں پہ اک سبز عینک لگا کر

یہ بے سبزہ میدان
سر سبز و شاداب بن جائیں گے
یہ بے آس فصلیں
خزاں کا لباس
اپنے جسموں سے یوں نوچ لیں گی
کہ جیسے کوئی سوکھا پتا
ہواؤں کے بے رحم جھونکوں کے ہاتھوں
وجود اپنا کھو بیٹھتا ہے
تم سمجھتے ہو
بس اک تمہارے لبوں کی ہنسی کے سبب
یہ ماحول کی تلخیاں
خود بخود ہو کے تحلیل مر جائیں گی
یہ تو ممکن نہیں
کیوں نہ ہم اپنے ماحول سے
تھرتھراتے لبوں سے
یہ بے چارگی چھین لیں
ایک بوسیدہ دیوار کی اوٹ میں
چھپ گئی ہے جو یہ چاندنی چھین لیں
روشنی چھین لیں

زندگی حق ہمارا ہے، ہم
موت سے زندگی چھین لیں

اشفاق حسین کی نظم اُن کے عزم و حوصلہ، مسائلِ حیات ایک حساس انسان کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول

''شاعر شباب کی جذباتی اور ہیجانی دنیا سے گزر کر سنجیدہ اور متین افکار کی حدود میں داخل ہوگیا ہے اور اس میں زندگی کے حقائق کو فنی تجربے میں لانے کا شعور پختہ ہوگیا ہے''۔ (صفحہ نمبر ۲۷۷)

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' اس کتاب کا اگلا مضمون ''سید محمد جعفری اور ظریفانہ شاعری'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

اُردو شاعری میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز سترہویں صدی عیسوی میں جعفر زٹلی سے ہوا۔ جنہوں نے اپنی اشعار میں امراء و رؤسا اور شاہان وشہزادگان کو طنز کا نشانہ بنایا۔ ان کے بعد سودا اور میر تقی میر نے ظرافت کی جانب توجہ دی۔ مرزا محمد رفیع سودا نے اپنی ہجویات سے اُردو شاعری میں طنز و ظرافت کا رنگ پیدا کیا اور میر تقی میر نے بھی ہجویات لکھی ہیں قدیم شعراء میں نظیر اکبر آبادی اور مرزا غالب کے یہاں بھی طنز و مزاح کے بعض کامیاب نمونے ملتے ہیں لیکن اردو کی ظریفانہ شاعری کے حوالے سے بھرپور شہرت اکبرالہٰ آبادی کے حصے میں آئی۔ اکبرالہٰ آبادی کے بعد یہ سلسلہ کامیابی سے چل نکلا۔ ظریف لکھنوی، حاجی لق لق، مولا بخش خضر تمیمی، علامہ حسین، میر کاشمیری، حکیم غلام نبی

اور دوسرے شعراء کے ساتھ ساتھ سید محمد جعفری کا نام بھی نمایاں رہا ہے۔

سید محمد جعفری نے اکبرالہٰ آبادی کا انداز اختیار کیا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"سید محمد جعفری کی زبان و بیان کی پختگی و چاشنی کے ساتھ بہ اعتبارِ موضوع جو ایک طرح کی جامعیت یا ہمہ جہتی نظر آتی ہے اور جس کے سبب اُن کی شاعری کا کینوس اُن کے ہم عصر مزاح نگار شعراء کے مقابلے میں زیادہ رنگین و وسیع ہوگیا ہے۔ اُس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ سید محمد جعفری اکتسابی شاعر نہیں فطری شاعر ہیں۔ جعفری کا شمار اُن کاریگرانِ شعر میں نہیں کیا جاسکتا جو محض زبان و بیان پر قدرت، علم و عروض و قافیہ سے واقفیت، کسی اُستاد قسم کے شاعر سے رشتہ تلمذ اور مشق و ریاضت کی بنیاد پر اچھے بڑے شعر کہنے پر قادر ہوجاتے ہیں۔ سید محمد جعفری نے شاعرانہ زندگی میں جو کچھ کہا ہے وہ تازگی و شگفتگی اور بے ساختگی و روانی کے آثار لئے ہوئے ہے۔۔۔ جعفری کے کلام کی ایک خصوصیت و انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں موضوعات کی رنگارنگی کے ساتھ ظرافت کی حیرت انگیز رنگارنگی بھی ہر جگہ نظر آتی ہے"۔

(صفحہ نمبر ۳۰۰)

نمونۂ کلام دیکھئے:

الیکشن کے رسیا کا دل شاد کر
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جو آیا ہے جلسے میں مردِ خطیب

ہے تقریر اُس کی عجیب و غریب
حریفوں پر تہمت لگاتا ہوا
لگاتا ہوا اور بُجھاتا ہُوا
بظاہر بیاں اُس کا سُلجھا ہُوا
دھڑے بندیوں میں پر اُلجھا ہُوا
تمدُّن، تصُوف، شریعت، کلام
الیکشن کے بُت کے پُجاری تمام
یہ اُمت اسی بات میں کھو گئی
حقیقت خُرافات میں کھو گئی
مُسلمان مسلمان پر شیر ہے
"بُجھی عشق کی آگ اندھیر ہے"

"اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ" اس کتاب کا بائیس واں مضمون مرزا محمود سرحدی۔۔۔طنز و مزاح کا معتبر نام" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا کے ادبی حلقوں میں بھی طنز و مزاح کے حوالے سے کئی نامور شعراء گزرے ہیں خاص طور پر احمد فراز، فارغ بخاری، محسن احسان، خاطر غزنوی اور رضا ہمدانی کی شہرت اور مقبولیت سے ہر کوئی آگاہ ہے۔مزاحیہ شاعری کے حوالے سے مرزا محمود سرحدی کا نام بھی محتاج تعارف نہیں۔ اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"مرزا محمود ایک حقیقت نگار مزاح نگار تھے۔ کسی سوچے سمجھے منصوبے

کے تحت محض مُضحکِ الفاظ، تراکیب یا قوافی و ردیف سے خواہ مخواہ ظرافت کا پہلو پیدا کر لینا ان کے دائرہ مزاح نگاری سے خارج تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کسی کے طرزِ کلام میں حقیقی دلکشی اور جانداری تکلف سے بڑی برجستگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ برجستگی ان کے یہاں حاوی عنصر کے طور پر ہر جگہ صاف نظر آتی ہے۔ چنانچہ روزمرہ کے واقعات جن سے ان کا واسطہ تھا، وہی ان کی شاعری کا اصل مواد تھے۔ ان واقعات سے ان کی زود اثر طبیعت ایسی بے ساختگی کے ساتھ مُضحک پہلو تراش لیتی تھی کہ ان کی ذہانت وطباعی دونوں کا قائل کر دیتی ہے''۔ (صفحہ ۳۰۲)

چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

جب وہ پہلے ملی تو چُپ چُپ تھی
اور میں تھا کہ بولے جاتا تھا

وہ دوبارہ ملی تو میں چُپ تھا
اور اُسے بولنے کا چسکا تھا

ہوئی شادی تو دونوں چُپ چُپ تھے
بولنے والا صرف مُلا تھا

پھر یہ عالم تھا دونوں بولتے تھے
اور سارا محلّہ سنتا تھا

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' اس کتاب کا آخری مضمون ''اُردو میں ہائیکو کی روایت اور پاکستانی شعراء'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔

اس تفصیلی مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری بیان کرتے ہیں کہ:

''ہائیکو'' جاپان کا تحفہ ہے۔ اس کا شمار جاپان کی مقبول ترین اصنافِ سخن میں ہوتا ہے اور جاپانی زبان کے بیشتر شاعروں نے اس میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اس کی مقبولیت کا سبب غالباً کچھ تو اس کی ہئیت کا اختصار ہے اور کچھ موضوعاتی اختصاص'' (صفحہ نمبر ۳۱۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مزید لکھتے ہیں:

''اب ہائیکو کی صنف، اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اجنبی نہیں رہی کم و بیش سبھی اہلِ ذوق اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہیں''۔

اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کئی شاعرں کی ہائیکو کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

''اُردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ۳۳۵ صفحات پر مشتمل تصنیف انتہائی اہم اور مفید کتاب ہے۔ اپنی افادیت کی بنا پر ادبی حلقوں میں مقبول ہے نئی نسل کیلئے اس کا مطالعہ نہایت سود مند ثابت ہوگا۔

''اُردو کی بہترین مثنویاں'' ایک مطالعہ

لفظ ''مثنوی'' مشتق ہے ثنیٰ سے جس کے معنی 'دو ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کے دو مصرعے ہوتے ہیں۔ اصنافِ سخن میں ''مثنوی'' بھی ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ ''مثنوی'' کا باوا آدم رودکی ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ میں اسے درجہ کمال تک پہنچایا نظامی نے پنج گنج میں ''مثنوی'' کو حقائق و معرفت سے آشنا کیا۔ مولانا روم کی مثنوی ''ہست قرآں در زبانِ پہلوی'' کہلاتی ہے۔ سعدی نے ''بوستان'' اور امیر خسرو نے اپنے خمسہ میں ''خوب گل'' کھلائے ہیں۔

اردو میں مثنوی کی ابتداء اردو شاعری کے ساتھ ہی ہوئی۔ نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اس سلسلے میں پہلی مثنوی ہے۔ غواصی کی ''پھول بن''، احمد جنید کی مثنوی ''ماہ پیکر''، محمود بحری کی مثنوی ''من لگن''، نصرتی کی ''علی نامہ''، ''گلشنِ عشق'' ملا وجہی کی ''قطب مشتری'' خاص طور پر قابلِ ذکر مثنویوں میں شامل ہوتی ہیں۔

میر تقی میرؔ نے کئی مثنویاں لکھیں اور میر دردؔ کے بھائی میر اثرؔ نے مثنوی ''خواب و خیال'' لکھی، لیکن اس دور کی مایہ ناز مثنوی میر حسنؔ کی ''سحر البیان'' ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ جرأتؔ نے دو مثنویاں ''برسات کی ہجو'' اور حسن و عشق'' لکھیں۔ آفتاب الدولہ قلقؔ نے مثنوی ''طلسمِ الفت'' لکھی اور واجد علی شاہ اخترؔ کی ''حزنِ اختر'' دلچسپ مثنویاں ہیں۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہے۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کو بھی کافی شہرت نصیب ہوئی۔ ان کی مثنوی

''زہر عشق'' ایک عمدہ شاہکار ہے۔

محسن کاکوروی نے ''صبح تجلی'' اور ''چراغ کعبہ'' لکھیں۔ شوق قدوائی کی مثنوی ''ترانہ عشق'' بھی مشہور مثنوی ہے۔ مثنوی کے سلسلے میں آزاد، حالی، حفیظ جالندھری اور علامہ اقبال نے نام پیدا کیا۔

''اُردو کی بہترین مثنویاں'' یہ نام ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف کا جس میں ''سحر البیان''، ''گلزارِ نسیم'' اور ''زہر عشق'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''مثنوی کی صنف بہ اعتبارِ ہیئت دوسری اصناف شعری کے مقابلے میں یوں آسان ہے کہ اس کا قافیائی نظام سخت اور تنگ نہیں ہے۔ ہر شعر کا قافیہ دوسرے شعر سے الگ ہوتا ہے اس لیے شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اپنے پسند کے قافیوں میں آسانی سے کہہ لیتا ہے۔ موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر قسم کے داخلی و خارجی موضوع پر مثنوی کہی جاسکتی ہے۔ نہ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ بحر و وزن کی کوئی تخصیص''۔

اپنی اس تصنیف میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تین مثنویوں کے پس منظر، محرک، موضوع، داستان، ماخذ، کردار، واقعات، مناظر اور زبان و بیان سب کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرا مضمون ''مثنوی کے لوازم'' کے عنوان سے لکھا گیا

ہے جس میں کئی حوالوں سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ مثنوی کے لیے تسلسل خیال، ربط بیان، موضوع کے تاریخی ارتقاء شاعرانہ قدرتِ خیال، وسعتِ مشاہدہ، نزاکتِ خیال اور لطیف اسلوب کا مثنوی میں ہونا ضروری ہے۔

علامہ شبلی ''شعرالعجم'' میں لکھتے ہیں:

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ جذباتِ انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا''۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''اگر مثنوی نگار شاعر باکمال ہوتو پھر ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ اور معمولی سے معمولی داستان بھی نظر گیر اور دلکش ہوجاتی ہے۔ ذرہ آفتاب اور قطرہ دریا بن جاتا ہے''۔

(''اردو کی بہترین مثنویاں'' ، ص ۱۸)

اس کتاب کا تیسرا مضمون ''سحرالبیان'' اور میر حسن کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں میر حسن اور انکا عہد، میر حسن کی مثنویاں ''سحرالبیان'' کی تخلیق کا پس منظر، ''سحرالبیان'' اور ''بوستان خیال''، ''سحرالبیان'' کی بحر میں بعض دوسری مثنویاں، ''سحرالبیان'' کا قصہ اور اسکے بعد کے ماخذ، ''سحرالبیان'' میں مافوق الفطرت عناصر، کردار اور اس کی خصوصیات، واقعات کی جزئیات نگاری، سماجی وتہذیبی زندگی کا عکس، میر حسن کا معاشقہ اور ''سحرالبیان'' پر اس کے

اثرات کے حوالے سے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اُردو کی طویل مثنویوں میں جو شہرت و قبول عام ''سحرالبیان'' یعنی شہزادہ بے نظیر و بدر منیر کی داستان کو حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری منظوم داستان کو نصیب نہ ہوا۔ میر حسن نے بے نظیر و بدر منیر کی داستان کو نظم کا جامہ پہنا کر اعلیٰ درجے کی بیانیہ شاعری کی بنا ڈالی اور اردو شاعری کے لیے ایک نیا میدان مہیا کر دیا۔ قصّے کے اعتبار سے بے نظیر و بدر منیر کا قصّہ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔ میر حسن نے اپنی جادو بیانی سے طول دے دیا ہے۔ واقعات کی تفصیل و جزئیات نگاری کی خصوصیتؔ اسے اتنا طویل کر دیا ہے کہ وہ اردو کی طویل ترین داستان معلوم ہوتی ہے''۔

(صفحہ۔۲۰)

میر حسنؔ نے اپنی اس مثنوی میں اُس دور کے شہزادوں اور رئیس زادوں کی تصویر کشی بڑی عمدگی سے کی ہے:

ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی
چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی

غضب منہ پہ ظاہر وے دل میں چاہ
نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ

یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں
میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی ، آن کی آن میں
چھپی جا کے اپنے وہ دالان میں

مثنوی ''سحرالبیان'' کی سب سے نمایاں خوبی اس کا حسن بیان ہے۔ جس پر خود میر حسنؔ کو بھی ناز ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''سحرالبیان میں ملکی و سیاسی حالات سے لے کر مذہبی، سماجی اور اخلاقی، ادبی سارے حالات خوش سلیقگی سے نظم ہوئے ہیں اور اسکی یہی خصوصیات اسے اردو کی دوسری مثنویوں سے ممتاز کرتی ہے''۔

(صفحہ۶۹)

مثنوی ''سحرالبیان'' کے بارے میں رام بابو سکسینہ ''تاریخِ اردو ادب'' میں لکھتے ہیں:

''عبارت اس قدر صاف اور با محاورہ ہے کہ صدہا شعر محاورہ کی صورت میں زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ صفائی بیان محاورہ اور شوخی مضمون قابلِ دید ہے۔ زبان وہی ہے جو آج ہم بولتے ہیں''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑی تفصیل سے اس مثنوی کا جائزہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ ''اُردو کی بہترین مثنویاں'' اس کتاب کا چوتھا مضمون

''گلزارِ نسیم ودیا شنکر نسیم'' کے بارے میں ہے۔جس میں نسیم اور ان کا عہد، گلزار نسیم اور قصہ گل بکاؤلی ، نثری قصے کا مصنف ، قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی ماخذ ، قصے کی مقامیت ، ریحان ورفعت کی مثنویاں ،قصہ گلزارِ نسیم کی اشاعت ومعرکہ، شرر چکبست ، گلزارِ نسیم کا موضوع اور داستان کا خلاصہ ۔دبستان لکھنؤ کی پہلی طویل وکامیاب مثنوی ،کردار ، واقعات اور جذبات کی مصوری ، سحر البیان اور گلزارِ نسیم کا تقابلی مطالعہ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :

''مثنوی گلزار نسیم میں دیا شنکر نسیم نے ''قصہ گل بکاؤلی'' کو نظم کا جامہ پہنایا۔یہ قصہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ پہلے سے اردو میں موجود تھا جیسا کہ خود نسیم کے اشعار سے ظاہر ہے''۔

قصہ یہ سُنایا گیا ہے اکثر
اردو کی زبان میں سخنور

وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں
اس مے کو دو آتشہ کروں میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''گلزار نسیم''لکھنوی دبستانِ شعر کی پہلی طویل نظم ہے جس میں مثنوی اور قصہ دونوں کے لوازم کا لحاظ پایا جاتا ہے ۔اس میں کردار نگاری ،

جذبات کی مصوری، تسلسلِ بیان اور روانی کی کم و بیش وہی صفات و محاسن موجود ہیں جو منظوم داستانوں کے لیے بالعموم ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے حسن و دلکشی کا راز دراصل اسکی رنگیں بیانی، معنی آفرینی، اختصار نویسی، کنایاتی اسلوب، تشبیہ و استعارے کے طرفگی اور لفظی صنائی میں پوشیدہ ہے۔ اس کے حسنِ اختصار کا یہ عالم ہے کہ جس طرح پوری داستان میں کوئی شعر بھرتی کا نہیں''۔ (صفحہ ۱۱۵،۱۱۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری آگے لکھتے ہیں:

''نسیم نے بکاؤلی کے کردار اور اسکے جملہ اوصاف و جذبات کو بڑی خوش سلیقگی سے پیش کیا ہے۔ دراصل بکاؤلی کی شخصیت و کردار کی جاذبیت وکشش نے پوری داستان کو سنبھالا دیا ہے''۔ (صفحہ ۱۳۱)

''اُردو کی بہترین مثنویاں'' اس کتاب کا آخری باب ''شوق اور مثنوی اور زہر عشق'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں نواب مرزا شوق، ''زہر عشق'' اور دوسری مثنویاں کا زمانہ تخلیق و اشاعت، مثنویاتِ شوق میں آپ بیتی کا رنگ ''فریبِ عشق'' کا اجمالی جائزہ، ''بہارِ عشق'' پر ایک نظر، ''زہر عشق'' شوق کا تخلیقی شاہکار، ''زہرِ عشق'' کی شہرت و مقبولیت، ''زہر عشق'' کی ہیروئن، ''زہر عشق'' کی زبان اور حُسنِ بیان اور اہلِ قلم کی آرا، جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نواب مرزا شوق کا تعلق اردو شاعری کے زریں دور سے ہے، یہ عہد مرزا غالب، مومن خان مومن، ظفر، واجد علی شاہ، آتش، ذوق، شاہ نصیر دبیر اور میر انیس

کا عہد تھا۔ یہ شعرا بلند پایہ غزل گو اور بعض مرثیہ نگار تھے، کچھ نے مثنوی نگار کے طور پر شہرت پائی۔ مثنوی ''زہر عشق'' نواب مرزا شوق کی ایک باکمال اور منفرد تخلیق ہے۔

مولانا حالی ''مقدمہ شعر و شاعری'' مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی کے صفحہ ۳۰۲ پر لکھتے ہیں:

''میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے گا تو ایک خاص حد تک ان کو بدر منیر پر ترجیح دی جا سکتی ہے''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مثنوی ''زہر عشق'' کا جائزہ بڑی عمدگی سے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''زہر عشق'' نواب مرزا شوق کی سب سے بہتر مثنوی ہے اور اثر انگیزی کے لحاظ سے اردو میں بہت کم ایسی مثنویاں ہیں۔ جو اس کے مقابلے میں لائی جا سکتی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ مرزا شوق نے مثنوی نگاری کی تاریخ میں روشِ عام سے بچ کر راہ نکلی یا طرزِ لکھنؤ سے بغاوت کی ہو، بلکہ لکھنؤ کے پُر تصنع ماحول میں انھوں نے حقیقی اور سچی شاعری کا مکمل نمونہ یادگار چھوڑا ہے اور اسی وجہ سے انھیں نہ صرف اُردو بلکہ بعض وجوہ سے دنیا کے بڑے مثنوی نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے''۔ (اردو کی بہترین مثنویاں۔ صفحہ ۱۸۰)

''زہر عشق'' اپنے ادبی و فنی محاسن کی وجہ سے اُردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں اس طویل نظم پر اردو ادب جس قدر

نازکرے کم ہے۔

''اردو کی بہترین مثنویاں'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نہایت اہم کتاب ہے۔اسکے مطالعے سے ادب کا طالب علم بہت فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اپنے علم و معلومات میں بھرپور اضافہ کرسکتا ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی فروری 2014

''غزل اُردو کی شعری روایت'' ایک مطالعہ

غزل اُردو شاعری کی سب سے اہم اور گراں قدر صنفِ سخن تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ صنف اپنے آغاز سے لے کر آج تک مختلف منزلیں طے کرتی جارہی ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی میں مسلسل اضافے کا یہ حال ہے کہ ہر سال درجنوں غزلیہ مجموعے منظر عام پر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو اس صنف سخن میں قدرتی لچک کا پایا جانا ہو سکتا ہے دوسرے یہ کہ حُسن و شباب اور عشق و محبت کا اظہار اس صنف میں آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

عشقیہ شاعری کی یہ خوبصورت صنف ہمیں ایران سے ملی اور فارسی زبان نے اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب ''غزل اردو کی شعری روایت'' میں لکھتے ہیں:

> ''غزل کو سب سے آسان اور مشکل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ایک بنا بنایا ڈھانچہ دستیاب ہے۔ اس کی ہیئت متعین ہے، قافیہ و ردیف کا جما جمایا نظام ہے اس نظام کے تحت مقبول ہونے والے خیالات و موضوعات اور استعمال ہونے والے مفرد و مرکب الفاظ کی فراوانی ہے۔ گویا صدیوں سے اردو غزل کا ایک سانچہ اپنی ضرورتوں کے ساتھ سامنے موجود ہے۔ ایسے میں طبع موزوں رکھنے والا شخص بہت آسانی سے اپنی بات کو اس سانچے میں ڈھال لیتا ہے''۔

''غزل اردو کی شعری روایت،، صفحہ ۱۳

غزل میں اتنی لچک شروع ہی سے رہی کہ یہ صنفِ سخن تصورات کی لطافتوں اور نزاکتوں کا بوجھ اُٹھا سکے اپنی اس صلاحیت کی بنا پر شعراء نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے اسے اہم ذریعہ جانا غزل نے بھی اپنے چاہنے والوں کو اپنے دامن میں خوش دلی سے جگہ دی یہی وجہ ہے کہ غزل گو شعراء کی تعداد ہر عہد میں بے شمار رہی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب ''غزل اُردو کی شعری روایت'' میں جن شعراء کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے اُن میں سب سے پہلا مضمون ولی دکنی کے بارے میں ہے۔ جس کا عنوان ہے ''ولی اردو غزل کا معمار اول'' اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ مقامی زبانوں کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ کی وہ خوبصورت پیوند کاری جس نے اردو شاعری خصوصاً اُردو غزل کو جنم دیا ہے وہ ولی سے پہلے کسی دکنی شاعر میں نظر نہیں آتی۔ ولی کی اُردو شاعری کا اثر ولی کے سارے شعرا نے کم و بیش قبول کیا تھا۔ اس نے اُردو شاعری کے لب ولہجہ کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ اُردو زبان میں ایک طرف فارسی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں سے وسعت پیدا ہوئی دوسری طرف مقامی رنگ سے ہم آہنگ ہونے لگی۔ ابہام گوئی کی وہ لعنت دور ہو گئی جس نے شاعری کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا تھا''۔

''غزل اردو کی شعری روایت'' صفحہ ۲۳

ولی کے چند اشعار دیکھئے :

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

زندگی جام عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر دوام نہیں

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

یہ حقیقت ہے کہ ولی نے غزل میں حسن کی سراپا نگاری، مقامی ماحول کی رنگ آمیزی محاورات اور تشبیہات و استعارات کو خوبصورت انداز میں اپنی غزل میں استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''غزل اُردو شعری کی روایت'' کا دوسرا مضمون خواجہ میر دردؔ کے بارے میں ہے جس کا عنوان ہے'' درد کی شخصیت، تصوف اور غزل گوئی'' خواجہ میر درد کے دل میں عشق حقیقی کی سچی تڑپ موجود تھی۔ تصوف اور معرفت سے انکی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ طبیعت میں خودداری، قناعت اور توکل بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان خصوصیات کا اثر ان کی شاعری پر پڑنا لازمی امر تھا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''خواجہ میر درد باکمال حلقے کے ایک باکمال رکن تھے۔ تصوف انکے نزدیک ان کے نظری فلسفہ روحانیت نہیں زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ انھوں نے تصوف کو ''برائے شعر گفتن خوب است'' کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ تصوف ان کے معمول اوران کی زندگی کا جز بن گیا تھا۔ درد کے کلام کا لب ولہجہ بڑا حیات خیز ہے وہ صوفی بزرگ ضرور ہیں لیکن زندہ دل عاشق کی طرح دنیاوی لذتوں سے ہم کنار ہونے کی دعوت بھی دیتے ہیں''۔

(''غزل اردو کی شعری روایت''، صفحہ ۳۹)

خواجہ میر درد کے چند اشعار دیکھئے:

سیر کر دنیا کی غافل زندگی پھر کہاں
زندگانی کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

بے وفائی پہ اس کی دل مت جلا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی ان سے ملاقات نہ ہونے پائی

خواجہ میر درد کی شاعری میں اثر، موسیقت اور سوز گداز پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''غزل اُردو کی شعری

روایت'' کا تیسرا مضمون ''میر کا عشق اور ان کی عاشقانہ غزل'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ میر تقی میر کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ ان کی زندگی میں رنج والم کا بہت دخل ہے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل میں ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ ان کی شاعری میں احساس کی شدت، تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت، سوز وگداز کی فراوانی، پُر خلوص سادگی، زبان و بیان کی فصاحت۔ سچے جذبات کی ترجمانی، بے تکلفی اور پاکیزگی اپنے عروج پر ہے میر کی گھریلو زندگی بڑی صبر آزما تھی۔ میر کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''میر کی شاعری اساسی طور پر عاشقانہ شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں جس عشق کا ذکر آیا ہے اس کا تعلق محبوبہ سے بھی ہے اور اس تہذیبی زندگی سے بھی جس میں انکی محبوبہ اور وہ خود پروان چڑھے تھے، جوان ہوئے تھے، احساس اور جذبے کی شدتوں سے دوچار ہوئے تھے اور عقل وشعور کی منزلوں کو پہنچے تھے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں براہ راست عشق ومحبت کے الفاظ بہت کم زیر بحث آتے ہیں۔ انھوں نے عشق کی تعریف وتعبیر کی بے کیف بحث نہیں چھیڑی ہاں عشق کی کیفیات اور آدمی کے جسم و جان پر ان کے ارتعاشات کا ذکر اکثر جگہ کیا ہے''۔ (''غزل اُردو کی شعری روایت'' صفحہ ۸۷)

دو شعر دیکھئے:

میر سے پوچھا جو میں نے عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''میر نے جس اختصار و سادگی اور حسن کاری و سحر آفرینی کے ساتھ لطیف سے لطیف اور دقیق سے دقیق محسوسات و افکار کو غزل کے شعر کا پیکر دیا ہے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ایسے شاعر روز روز نہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں''۔

(''غزل اردو کی شعری روایت''، صفحہ ۹۱)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف کا چوتھا مضمون ''میر و غالب کا درمیانی عہد اور غزل'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔جس میں میرزا غالب کے درمیانی عرصے میں غزل گو شعراء کا ذکر کیا گیا ہے خاص طور پر خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''آتش دبستانِ لکھنؤ کے پہلے شاعر ہیں۔جن کی بدولت لکھنؤی شاعری کو دبستان دہلی اور اس کی ہم سری کا منصب نصیب ہوا ہے۔آتش لکھنؤی، میر کی طرح تصوف کے خانوادے میں پلے بڑھے تھے۔ان کے خاندانوں میں پیری مریدی کا سلسلہ برسوں سے قائم تھا اور گھریلو ماحول کچھ اس انداز کا تھا کہ اس میں تربیت پانے والا حرص و ہوس سے دور، خدا ترسی اور خدا پرستی میں ہی پناہ لے سکتا تھا۔انھوں

نے ذاتی محنت اور کوشش سے اپنے آپ کو مروجہ علوم وفنون سے آراستہ کرلیا۔ آتش کو اس کا پورا احساس تھا کہ شاعری ایک مشکل فن ہے، اس فن میں لفظوں کا انتخاب الفاظ کی بندش اور ان کا برتنا آسان نہیں ہوتا''۔ (''غزل اردو کی شعری روایت'' صفحہ ۹۳)

آتش کے بہت سے اشعار زبان زد عام ہوئے۔ مثلاً

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ ہوتا ہے

میر و غالب کے درمیانی عہد کے ایک اہم شاعر ناسخ ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

''ہر چند کہ زبان کی صفائی پر وہ زور دیتے ہیں لیکن زبان کی اصلاح کے شوق نے اُن کے یہاں عربی فارسی کے موٹے موٹے غیر مانوس الفاظ بھی داخل کر دیے ہیں۔ اور زبان کے مسائل پر ضرورت سے زیادہ زور

دینے کے سبب ان کی شاعری کا رشتہ عموماً خیالات و جذبات کی سچائیوں سے ٹوٹ گیا ہے زبان کی صحت و صفائی کی طرف جیسی شعوری توجہ انھوں نے کی ہے کسی نے نہیں کی"۔ ("غزل اردو کی شعری روایت" صفحہ ۱۰۱)

ناسخ کے اشعار پیشِ خدمت ہیں:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے
بگڑے ہوئے تمام میرے کام بن گئے

بام پر نکلے نہ تم آؤ شب مہتاب میں
چاندنی پڑ جائے گی میلا بدن ہو جائے گا

"غزل اُردو کی شعری روایت" کا پانچواں مضمون "غالب کا انداز فکر اور اسلوب غزل" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ ان کی شاعری دلنشین اور دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ خیال انگیز بھی ہے۔ ان کا کلام فارسی اور اُردو میں موجود ہے۔ فارسی سے انھیں بے حد مناسبت تھی لیکن ان کی شہرت اُردو شاعری کی مرہون منت ہے۔ مضمون آفرینی، تنوع، موثر لب ولہجہ، حقائق نگاری، ظرافت، روایت شکنی، دشوار پسندی

اور ایجاز و اختصار ان کی شاعری کے بنیادی اوصاف ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"غالب کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ زندگی اور فن کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز اور نتائج اخذ کرنے کی روش اپنے معاصرین اور اپنے عہد کے مروجہ اصول اور اقدار سے بہت مختلف تھی ۔ان کا مشاہدہ تیز، ادراک، ہمہ گیر اور نگاہ دور رس تھی ۔ان کی اس دور بینی اور تہذیبی بصیرت کا اندازہ کئی باتوں سے ہوتا ہے"۔

("غزل اردو کی شعری روایت"، صفحہ ۱۰۶)

ڈاکٹر فرمان صاحب مزید لکھتے ہیں:

"شعر و سخن سے غالب کا مقصود قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی تھا۔اسی لیے ان کے یہاں بعض دوسرے شعراء کی طرح معانی، الفاظ یا زبان کے پابند نہیں رہے، بلکہ اقبال کی طرح ان کی زبان ہمیشہ خیالات و موضوعات کی پابند ہوتی ہے"۔

("غزل اردو کی شعری روایت"، صفحہ ۱۱۲)

غالب نے طنزیہ لب و لہجہ بھی اختیار کیا مثلاً ان کے اشعار

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

استفہامیہ لب ولہجہ بھی غالب کے کلام میں موجود ہے۔ مثلاً

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

غالب کہتے ہیں:

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھرپور انداز میں غالب کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ ''غزل اُردو کی شعری روایت'' اس کتاب کا چھٹا مضمون ''اردو غزل، غالب اور اقبال کا درمیانی عہد'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''یہی وہ زمانہ ہے جب مغربی و مشرقی تمدن کا تصادم ہوا، پُرانی قدریں ایک ایک کر کے مٹنے لگیں، نئی قدریں جڑ پکڑنے لگیں۔ نئے علوم و فنون کی مانگ بڑھ گئی۔ پُرانے علم و فن کی قدرو قیمت گھٹنے لگی

۔اس لیے زمانے کو غالب کے شاگرد اور سرسید کے رفیق کار مولانا حالی کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو غزل ایک ایسے موڑ پر آگئی تھی جیسے انقلابی موڑ کہہ سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو غزل گو شعراء دو خاص گروہ میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایک وہ جس میں حالی، آزاد، اکبر، شبلی، وحیدالدین سلیم اور سرور جہاں آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرا گروہ خلیل، صبا، رند، برق، رشک، ظہیر، انوار، مجروح، سالک، نسیم، تسلیم، نظام شاہ، امیر مینائی، داغ اور جلال وغیرہ پر مشتمل تھا۔داغ البتہ طرز قدیم کے ایک ایسے غزل گو شاعر ہیں جنہیں صاحب طرزِ غزل گو کہنا چاہیے ،امیر مینائی آخر تک لکھنوی طرز کو نبھانے کی کوشش کرتے رہے۔ مولانا حالی بھی داغ کے مداحوں میں شامل تھے“۔

(”غزل اردو کی شعری روایت“، صفحہ ۱۴۲)

غالب اور اقبال کے درمیانی عہد میں شاد عظیم آبادی اور نظم طباطبائی بھی بہ حیثیت غزل گو مشہور ہوئے۔شاد نے غزل گوئی میں میر تقی میر کی آواز سے آواز ملانے کی کوشش کی ہے۔اُن کے کلام میں منفرد اسلوب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی رچاؤ پایا جاتا ہے۔اسی دور میں نظم طباطبائی نے غزلیں بھی کہیں ہیں لیکن انکی شہرت کا دارومدار نئی طرز کی نظموں پر رہا۔اس دور میں حالی نے غزل کے لب ولہجہ کو وسعت بخشی اور اسے غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم روزگار کا بھی موضوع بنایا ۔جدید غزل میں سادگی کے ساتھ ساتھ موضوعات کے دائرے کو وسعت

دی۔ قومی وملی مسائل کو غزل کا موضوع بنایا۔ چند اشعار دیکھیے:

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کرلو نوجوانوں اُٹھتی جوانیاں ہیں

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہوجائے نفرت زیادہ

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب اور اقبال کے درمیانی عہد میں حالی نے اپنے کلام سے اردو شاعری کو وسعت دی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ''غزل اردو کی شعری روایت'' کا ساتواں مضمون ''علامہ اقبال اور اردو غزل میں فکر تازہ کی نمود'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر علامہ اقبال کا مرتبہ بہت بلند ہے، اُن کے کلام میں ادبی حُسن کے ساتھ ساتھ شعریت بھی ہے۔ اُنھوں نے اپنے خیالات کی وسعت فکر اور جذبے کی صداقت سے اردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا ہے اسکے ساتھ ہی تمدن اور معاشرت کی تخلیق بھی کی ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نئے نئے سانچے تیار کیے، کلام میں شاعرانہ موسیقی، لفظی جادوگری اور ایجاز و اختصار سے بھی کام لیا اور شاعری سے دعوتِ فکر و عمل کا کام بھی کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال نے حکیمانہ موضوعات اور نظری مسائل کو غزل میں جگہ دے کر اس خیال کا بطلان کردیا۔ ان کی غزلوں میں معنوی تسلسل یا وحدت

تاثیر کی کیفیت تو خیر ہر جگہ موجود ہی ہے جو کہ ایک ہی موڈ میں کہی ہوئی غزل کے اشعار میں بہر طور رونما ہو جاتی ہے لیکن ان کی غزلوں میں وہ خارجی آہنگ بھی موجود ہے۔ جو اقبال سے پہلے صرف نظم کا طرہ امتیاز خیال کیا جاتا تھا۔ (''غزل اردو کی شعری روایت''، صفحہ ۱۷۱)

چند اشعار دیکھیے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہے
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

علامہ کے یہ اشعار نظم کی سی خوشنمائی اور وحدت تاثیر رکھتے ہیں بقول پروفیسر سید وقار عظیم:

''اقبال نے اپنی غزلوں کے ذریعے اردو غزل کی روایات کو ایک نئی آواز نئے لہجے سے آشنا کیا اور غزل کے فن کا ایک نیا مفہوم اور یقیناً

وسیع تر مفہوم سامنے آیا''۔

(اقبال شاعر اور فلسفی از پروفیسر سید وقار عظیم ناشر مطبع عالیہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص۔۱۸۴)

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''اقبال کی غزلوں میں مختلف مقامات پر شاعر کی حیثیت اس کے خیال اور جذبے کو ایک نئی شکل دیتی ہے اور ہر مقام پر ایک شکل دوسری سے مختلف اور ایک لہجہ دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے غزلوں میں اقبال کے لہجے کی یہ بدلتی ہوئی کیفیت پڑھنے والوں کو کبھی چونکا دیتی ہے اور کبھی حیرت میں ڈال دیتی ہے''۔

(''غزل اُردو کی شعری روایت''، صفحہ۔۱۷۶)

''غزل اردو کی شعری روایت'' کا آٹھواں مضمون ''مولانا حسرت موہانی منفرد شخصیت منفرد غزل گو'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''مولانا حسرت موہانی کی شخصیت دراصل ایک صوفی، ایک مجاہد، ایک رہنما، ایک حر، ایک مسلمان اور مردحق آگاہ کی شخصیت ہے۔مولانا حسرت کی شخصیت بظاہر ایک عجیب وغریب لیکن حقیقتاً ایک کامل انسان کی شخصیت ہے''۔ (''غزل اردو کی شعری روایت''، صفحہ۔۱۸۳)

اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

"حسرت کی غزل گوئی قدما کی غزل گوئی سے ہم آہنگ بھی ہے اور اس سے بہت الگ بھی۔ ان کی شاعری میں محبت اور دنیائے محبت کے کچھ ایسے تجربے اور ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو ان سے پہلے تک اردو شاعری کے قاری کے لیے ناشنیدہ و ناچشیدہ تھیں۔ حسرت کی محبت اور حسن پرستی کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا مشکل نہیں ہے۔ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت موہانی عشق سے زیادہ حسن کے شاعر ہیں۔ حسن انھیں جہاں کہیں نظر آیا اور جس روپ میں نظر آیا ہے انھوں نے اپنے ذوق جمال کی تسکین کی حد تک اس سے لطف اُٹھایا"۔

("غزل اردو کی شعری روایت"، صفحہ ۱۹۲)

"غزل اُردو کی شعری روایت" کا نواں مضمون "جگر کی غزلیہ شاعری اور ان کا مرتبہ شاعرانہ" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"جگر صاحب زندگی کی ہر تیرگی میں ایک طرح کی روشنی، ہر درد میں ایک طرح کی شادمانی، ہر اضطراب میں ایک طرح کی آسودگی، ہر آنچ میں ایک طرح کی ٹھنڈک اور ہر دور میں ایک طرح کی قربت محسوس کر لیتے ہیں"۔ ("غزل اُردو کی شعری روایت"، صفحہ ۲۱۴)

جگر صاحب کے اشعار بھی بڑی عمدگی سے مضمون میں شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً

تیرے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

حُسن کو بھی کہاں نصیب جگر
وہ جو اِک شے مری نگاہ میں ہے
دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

اس کتاب کا دسواں مضمون ''فراق گورکھپوری کی غزل ،ایک نیا رنگ و آہنگ'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''فراق کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ خیال بھی یقین کی صورت اختیار کرلیتا ہے کہ غزل کی قلمرو تنگ نہیں بہت وسیع ہے اوراس میں شعور و لاشعور اور داخلیت و خارجیت کے سارے مسائل و معاملات اور جملہ انسانی افکار باآسانی جگہ پا سکتے ہیں''۔

(''غزل اردو کی شعری روایت''، صفحہ ۲۲۸)

کتاب کا آخری مضمون ''مجروح سلطانپوری کی غزل پر ایک نظر'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''مجروح اپنے فنی لب و لہجہ سے ہمیں جس رندانہ جسارت اور مردانہ

اولوالعزمی کا احساس دلاتا ہے وہ رسمی یا تقلیدی نہیں ہے بلکہ اس کی سرحدیں اعتقاد و ایقان سے ملی ہوئی ہیں''۔

(''غزل اردو کی شعری روایت'' صفحہ۔۲۴۴)

مجروح کہتے ہیں:

ہم روایات کے منکر تو نہیں ہیں لیکن
سب میں اور سب سے الگ اپنی ڈگر ہے کہ نہیں
اپنی اپنی ہمت ہے اپنا اپنا دل مجروح
زندگی بھی ارزاں ہے موت بھی فراواں ہے

''غزل اُردو کی شعری روایت'' ایک نہایت اہم تصنیف ہے جس کا مطالعہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔ یہ کتاب الوقار پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

''ادب اور ادب کی افادیت'' ایک مطالعہ

علم اور ادب کے درمیان ایک قدیم رشتہ قائم ہے۔اس رشتہ کی بدولت انسان کی تمدنی زندگی ہر زمانے میں ایک دوسرے کی مددگار رہی ہے،ادب اور ادیب کی دنیا سود وزیاں کے عام پیمانوں سے مادرا ہوتی ہے۔اس لئے ادب کی افادیت معلوم کرنے کا بھی پیمانہ نہیں۔ادب کے فوائد بے شمار ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''ادب اور ادب کی افادیت'' ایک اہم کتاب ہے۔یہ کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے۔

حصّہ اوّل میں سات مضمون ،حصّہ دوم میں چھ اور حصّہ سوم میں تین مضمون شامل ہیں،یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن لاہور سے شائع ہوچکے ہیں۔پہلا مضمون ''ادب اور ادب کی افادیت'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''علم اور ادب،میری مراد تخلیقی ادب سے ہے،اپنی ماہیت اور غایت میں ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں،عملاً انسان کی تمدنی زندگی،خصوصاً حق وصداقت کی جستجو اور حصول کے باب میں وہ ایک دوسرے کے معاون و حریف نہیں بلکہ معاون و حلیف رہے ہیں۔انسان کی تخلیقی قوت و سرگرمی کا اصل سرچشمہ اس کا وہ علم و ادراک ہے جس کی مدد سے اس نے صرف یہی نہیں کہ خود کو جبلتوں

کے جبر سے نجات دلائی بلکہ جذبے اور احساس کی سطح پر جینے کا حوصلہ پیدا کر کے اپنے آپ کو ساری مخلوق سے ممتاز کرلیا"۔ (صفحہ نمبر ۸)

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادب علم وفکر کا حلیف نہیں بلکہ ایک حد تک ان کا حریف ہے۔ بقول یگانہ چنگیزی ؎

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"ادب معاشرے کے بہت سے ایسے پہلوؤں اور متعدد ایسی باتوں کو اپنا موضوع سخن بناتا ہے جو کسی اور وسیلے سے ہمارے ہاں معرض اظہار میں آ ہی نہیں سکتیں اور اگر آئیں تو معیوب، غیر مستحسن، فحش، متبذل، رکیک، غیر ثقہ اور بعض صورتوں میں گردن زدنی قرار پائیں گی"۔

(صفحہ نمبر ۱۹)

اس باب کا دوسرا مضمون "ادب کی نئی اور پرانی قدریں" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"ادب چونکہ براہِ راست زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اگر ہم زندگی کی قدروں، ان کے عوامل ومحرکات اور عہد بہ عہد ان کی تبدیلیوں کے اسباب کو سمجھ لیں تو ادب کی نئی اور پرانی قدروں کا سمجھ لینا کچھ ایسا مشکل نہیں رہ جاتا"۔ (صفحہ نمبر ۲۵)

یوں تو ادب کی تاریخ کو متعدد ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے

تین اہم ادوار گزرے ہیں۔ پہلا دور پندرہویں صدی سے شروع ہو کر نظامی دکنی ،ملا وجہی اور آخر میں واجد علی شاہ اور مومن خاں مومن کی شاعری پر تمام ہوتا ہے۔ دوسرا دور الطاف حسین حالی ،محمد حسین آزاد سے لیکر اقبال تک ختم ہوتا ہے اور تیسرا دور ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول:

''ادب کسی خاص عہد، کسی خاص تہذیب، کسی خاص نظام کی آئینہ داری کے باوصف ایسا جمالیاتی اثر پیدا کرتا ہے جو اسے تاریخی ماحول سے بلند و برتر کر دیتا ہے۔ دنیا کے فنون لطیفہ کے بڑے بڑے شہ پاروں کے غیر فانی ہونے کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص ماحول کی حقیقتوں کو ان کی اپنی سطح سے بلند کر کے نئی سطح پر از سر نو پیدا کرتے ہیں اور زندگی کی ارتقائی تخلیق میں معاون ثابت ہوتے ہیں''۔

اس کتاب کا تیسرا مضمون ''ادبی تنقید میں اختلاف رائے کی اہمیت'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون عام قارئین کے علاوہ ادیبوں کے لیے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ناقدین خاص طور پر اس مضمون کے مطالعہ سے سوچ و بچار اور واقعات و تجربات کو کسوٹی پر پرکھنے کے لیے حقائق کے ادراک و احساس کی نئی نئی سمتوں کے تعین میں مفید پائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''ادب چونکہ زندگی کی تعبیر و تنقید اور از سر نو تشکیل کا دوسرا نام ہے اس لیے یہاں بھی اختلاف رائے کو ناگزیر خیال کرنا چاہیے بلکہ ادب میں اس کی گنجائش اور اہمیت دوسرے علوم و فنون کے مقابلے میں کچھ اور بڑھ

جاتی ہے۔وجہ یہ ہے کہ ادب کی زبان اور اسکے اثرات کی نوعیت
دوسرے علوم وفنون کی زبان اور اثرات کی نوعیت سے بہت مختلف ہوتی
ہے۔ادب کے تقاضے کچھ ایسے ہیں کہ یہاں دو اور دو چار کی صورت
میں کوئی نتیجہ نکلتا بھی نہیں ،جس دن ایسا ہوا ،ادب ،ادب نہ رہے گا کچھ
اور ہو جائے گا۔اس لیے ادبی مسائل میں اختلاف رائے کی نوعیت سخت
اور قطعی نہیں بلکہ لچکدار اور نرم ہونی چاہیے''۔ صفحہ نمبر ۴۰۔۳۵

''ادب اور ادب کی افادیت'' اس کتاب کا چوتھا مضمون ''جدید حسیت کیا
ہے؟'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''جدید حسیت کی ترکیب اگرچہ نئی ہے لیکن اس کے لغوی مفہوم پر غور
کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا اس نوع کی حسیت ہر فرد اور ہر دور
میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے اور وہ اپنے پیش رو افراد یا عہد
کے مقابلے میں نئی کہلائی ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو قدیم و جدید کے الفاظ
وجود میں نہ آتے نیز انسانی تمدن کے ایک عہد کو دوسرے عہد سے ممیز
کرنا مشکل ہو جاتا ہے''۔ صفحہ نمبر ۴۱

''ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف کا پانچواں مضمون ''اکیسویں
صدی ،نئی نسل اور ہماری ذمہ داریاں ،کے عنوان سے کتاب کا حصہ بنا ہے۔جس
میں ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں:

''ہمیں اپنی ساری توجہ نوخیز و نوعمر معصوم بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف
کرنا چاہیے۔تعلیم زندگی کی ساری کامیابیوں اور سارے مسائل کے

حل کی کلید ہے۔ اگر یہ کلید ایک بار ہاتھ آجائے تو کسی اور دفاعی ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی''۔ صفحہ نمبر ۴۶

''مشاعرہ ایک مقبولِ عام ثقافتی ادارہ'' کے عنوان سے چھٹا مضمون کتاب میں شامل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''مشاعرہ'' باہم شعر گوئی، شعر خوانی یا مل جل کر اشعار پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اگرچہ باعتبار عربی قواعد یہ مصدور ہے لیکن اردو میں بطور اسم ہی مستعمل ہے۔ اس کا اسم فاعل، مجاہد، مقابل، محاسب اور مبارک کی طرح مشاعر ہے یعنی شعر پڑھنے والے کو مشاعر کہنا چاہیے لیکن اردو میں مشاعرہ تو رواج پا گیا، مشاعر کو جگہ نہ مل سکی۔ مشاعرے کا رواج ہمارے ہاں نیا نہیں بہت پُرانا ہے اور اس نے سماجی و تہذیبی زندگی خوشگوار بنانے میں بہت موثر کردار ادا کیا ہے''۔ صفحہ نمبر ۵۲

اس باب کا آخری مضمون ''قومی اور بین الاقوامی سطح پر اُردو کی مقبولیت کے اسباب'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے ہے کہ:

''اُردو اپنی ساخت میں بین الاقوامی مزاج کی مخلوط زبان ہے۔ اس کا بنیادی ڈھانچہ مقامی ہے، لیکن اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ اس کثرت سے اور اس انداز سے داخل ہوگئے ہیں کہ یہ اپنی اساس میں بین الاقوامی زبانوں کی ایک انجمن بن گئی ہے اور ہر شخص کے لئے ایک کشش رکھتی ہے۔ ایشیائی زبانوں خصوصاً عربی، فارسی، سنسکرت اور

ہندوستان و پاکستان کی دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ کی تعداد بھی اس میں خاصی ہے، اردو کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تحریر میں دنیا کی ساری زبانوں کے مقابلے میں کم سے کم وقت اور جگہ لیتی ہے''۔

''ادب اور ادب کی افادیت'' اس کتاب کے دوسرے باب کا پہلا مضمون کولمبیا یونیورسٹی کی پروفیسر فرانس ڈبلیو پریچٹ کی کتاب ''دام آگہی'' کے بارے میں ہے جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے، جبکہ دوسرا مضمون ''ترقی پسند تحریک اور احتشام حسین'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، انہوں نے اردو افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، تنقید، لسانی مسائل، نظم و غزل گویا کے ہر گوشے کو منور کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اُردو ادب میں پروفیسر احتشام حسین کے کئی حوالے ہیں۔ انہوں نے شاعری بھی کی، افسانے بھی لکھے، فکر انگیز سفرنامہ بھی اردو کو دیا۔ کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ ادبی جلسوں میں خطبے بھی دیئے، لسانیات کی جانب بھی توجہ کی اور ترجمے بھی کیے۔ اُردو میں ان کا معتبر ترین حوالہ تنقید ہے''۔

اس باب کا تیسرا مضمون ''جوش ملیح آبادی، انقلابی سوچ کے حوالے سے'' کے عنوان سے تحریر ہوا ہے۔ جوش کو شاعر انقلاب بھی کہا جاتا ہے اور شاعر شباب بھی اپنے تفصیلی مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''جوش نے جو کچھ کہا، کیا قطعات، کیا رباعیات، کیا نظمیں اور کیا

مرثیے سب میں ان کی رومانی سوچ ،ان کی انقلابی روح، ان کی باغیانہ طبیعت، الفاظ کی سطح پر نہیں معنی کی تہہ میں موجیں مار رہی ہیں۔وہ زندگی کے وجدانی اور روحانی عنصر کو حیوانی اور مادی عنصر پر ترجیح دیتے ہیں۔رومانی اور انقلابی سوچ رکھتے ہیں اور زندگی کو تازہ امکانات سے لبریز و بے کراں جانتے ہیں''۔

''مرزا ادیب کے افسانے اور اقدار حیات کے پیمانے'' کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

''میرزا ادیب کے افسانے واضح طور پر کامٹ منٹ کے افسانے ہیں ۔ان کا یہ کامٹ منٹ ظالم و مظلوم کی جنگ میں شروع سے مظلوم کے ساتھ ہے''۔

''کچھ میر انیس اور ان کے سلام کے بارے میں'' تحریر کردہ مضمون بھی اپنی مثال آپ ہے اور مولانا عارف ہسوی کے متعلق لکھا گیا مضمون بھی بڑی تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔

''ادب اور ادب کی افادیت'' اس کتاب کا تیسرا باب تین مضمونوں پر مشتمل ہے، پہلا مضمون ''واسوخت کا موجد اور اردو واسوخت'' کے بارے میں ہے ۔یہ مضمون بڑا تفصیلی ہے اور آخر میں حواشی بھی درج ہے ۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''واسوخت اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے اور اس کی روایت کا سلسلہ بھی دوسری اصناف کی طرح فارسی شاعری سے ملتا ہے لیکن افسوس کہ اس

صنفِ سخن پر اتنا تحقیقی وتنقیدی کام نہیں ہوا جتنی کہ وہ مستحق تھی''۔

دوسرا مضمون ''قصہ گل بکاولی افسانہ یا حقیقت؟ کے عنوان سے تحریر ہوا ہے۔ تفصیلی حواشی کی مدد سے تحریر کردہ اس مضمون میں ثابت کیا گیا ہے کہ قصہ گل بکاولی افسانہ ہی نہیں حقیقت بھی ہے۔

اس کتاب کا آخری مضمون ایک سفر کی روداد سے متعلق ہے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مختلف ممالک کے سفر کیے، اس مضمون میں چین میں پندرہ روزہ قیام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''چین میں، میں نے محسوس کیا کے لوگوں کو پاکستان اور اہلِ پاکستان سے واقعی بڑی محبت ہے۔ ہم لوگ جہاں سے بھی اور جدھر سے بھی گزرے چین کے عوام نے ہمیں وضع قطع اور لباس و پوشاک سے پہچان لیا۔ خوش آمدید کہا، چین کے مصنفین، پروفیسر، مترجم شعرا و ادیب اور دوسرے ذمہ دار بڑے افسران ہماری پذیرائی اس طرح کر رہے تھے جیسے ہم بڑے اور وہ چھوٹے ہیں حالانکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے''۔ صفحہ نمبر ۲۰۵

چین میں اُردو سے بھی بڑی محبت پائی جاتی ہے۔ وہاں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور بی اے تک کا اردو نصاب موجود ہے۔ ایم اے اُردو کی تدریس بھی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام صورت حال کا تفصیلی ذکر اپنے سفر نامے میں کیا ہے، ادب اور ادب کی افادیت یہ کتاب بہت اہم اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''نگار پاکستان''، مئی۔ جون 2014ء، کراچی)

''عملی تنقیدیں'' ایک مطالعہ

''عملی تنقیدیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ اہم تصنیف پہلی بار جولائی ۲۰۱۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب شاعری اور شخصیت کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں ولی دکنی سے لے کر جگر لخت لخت تک کل دس مضمون شامل ہیں۔ ان مضامین میں شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے مثلاً مضمون ''ولی دکنی اُردو کا باوا آدم'' ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔

''افسوس کہ اُردو غزل کے باوا آدم کی زندگی و کلام کہ اہم پہلو ہنوز تشنہء تحقیق ہیں۔ ولی دکنی کی زبان و بیان میں مقامی زبانوں کے ساتھ فارسی و عربی کا اثر بہت نمایاں ہے ولی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مقامی زبان کے ساتھ فارسی و عربی کا خوبصورت پیوند لگایا اور اس کے مرکب کو ایسا خوبصورت معیار عطا کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں میر تقی میر، درد، سودا جیسے نامور شعراء سامنے آگئے۔ ولی نے اردو میں فارسی تراکیب و محاورات کو بکثرت اور بڑی خوش اسلوبی سے کھپایا ہے ان کا شاعرانہ مرتبہ غالب و اقبال کے ہم پلہ نہ سہی لیکن اردو کے دامن کو وسیع تر کرنے میں ان کی خدمات اقبال و غالب سے کم درجے کی نہیں۔ (صفحہ۔ ۲۵)

ولی دکنی کی غزل گوئی کے موضوعات نے حُسن کی سراپا نگاری اور مقامی ماحول کی رنگ آمیزی سے خوشگوار اضافہ کیا ہے چند اشعار دیکھئے

زندگی جام عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر دوام نہیں

خوبرو خوب کام کرتے ہیں
اِک نگہ میں غلام کرتے ہیں

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

ولی دکنی کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مضمون بہت تفصیلی اور اہم ہے اس باب کا دوسرا مضمون ''فارسی کی پہلی شاعرہ''، ''رابعہ'' کے بارے میں ہے۔رابعہ فارسی کے قدیم ترین شعراء رودگی، شہدید، بلخی وغیرہ کی ہم عصر تھیں اور اس کا تعلق خاندان سامانیہ کے ممتاز دور سے ہے جو فارسی شعر وادب کا اولین دور کہلاتا ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی تصنیف ''عملی تنقیدیں'' کے صفحہ ۳۹ پر لکھتے ہیں:

''رابعہ فارسی ادب کی پہلی قابل ذکر شاعرہ ہیں یہی نہیں بلکہ وہ فارسی ادب کے معماروں اور موسسوں میں شمار کیے جانے کے لائق

ہیں۔ انہوں نے اس وقت فارسی میں شعر گوئی کی جب فارسی اپنے مقامی رنگ میں پہلے پہل ایران میں قدم جما رہی تھی اس کے فارسی کلام میں عربی الفاظ تراکیب اور فقرے بکثرت استعمال ہوئے ہیں''۔

''عملی تنقیدیں'' اس کتاب کا تیسرا مضمون سیماب اکبرآبادی کی شاعری سے متعلق ہے جس میں ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''سیماب کی شخصیت اردو ادب میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اردو شاعری میں نئے اقدار حیات کو داخل کرنے، جدید رجحانات کی شاعری کو اصل منزل کی طرف موڑنے، شعوری جدوجہد میں سیماب کی کوشش ہمیشہ مشکور رہیں گی۔ سیماب کا نام کوئی عدل پسند مورخ یا ناقد نظر انداز نہیں کر سکتا''۔ (ص۔۵۲)۔

سیماب اکبرآبادی نظم نگار کے ساتھ ساتھ بلند فکر غزل گو بھی تھے انہوں نے غزل میں زندگی کے لئے نئے تجزیوں اور سیاسی و سماجی رجحانات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''عملی تنقیدیں'' کا چوتھا مضمون ''اردو کی عشقیہ شاعری اور اقبال'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو کی عشقیہ شاعری کے گمراہ کن اور مہلک حیات رویہ سے بغاوت کا اعلان کیا۔ اقبال کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان، دشمن عقل، ازخود رفتگی

،فنا آمادگی یا محدود کو لامحدود میں گم کر دینے کا نام نہیں بلکہ اقبال کے ہاں عشق کا نام ہے ایک عالمگیر قوت حیات کا عمل سے سرشاری کا حصول مقصد کے لئے بے پناہ لگن کا عزم و آرزو سے آراستہ جہد مسلسل کا'' اقبال فرماتے ہیں:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

''عملی تنقیدیں'' اس کتاب کا پانچواں مضمون ''مولانا احمد رضا، منفرد نعت گو شاعر'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''جہاں تک نعتیہ شاعری کا تعلق ہے اردو میں جو مقبول عام مولانا احمد رضا صاحب کی شاعری کو میسر آیا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا ان کی نعتیں اپنی مخصوص سادگی و پرکاری کے سبب عام و خاص ہیں''

''عملی تنقیدیں'' کا چھٹا مضمون ''فیض احمد فیض اور ان کے ابتدائی شعری مجموعے'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے اس سلسلے میں فرمان صاحب کا خیال ہے کہ:

''نقش فریادی'' سے پتہ چلتا ہے کہ فیض کی شاعری کا آغاز بھی دیگر شعراء کی طرح خالص رومانی اور عشقیہ شاعری سے ہوا ہے جس سے ہر

نوجوان دوچار ہوتا ہے نقش فریادی کے آخری حصے میں فیض کی شاعری کے مقصد عناصر واضح ہو رہے ہیں ''دست صباء'' تک پہنچتے پہنچتے فیض نے ذاتی مشاہدہ کی مدد سے نت نئی تشبیہ و استعارے کی تخلیق و استعمال سے اپنے پیرایۂ بیان کو منفرد بنا دیا ہے''۔

''عملی تنقیدیں'' کا ساتواں مضمون ''غالب نو دریافت بیاض کی روشنی میں'' کے عنوان کے تحت قلم بند کیا گیا ہے۔

دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ جو پاکستانیوں کو نقوش کے مدیر محمد طفیل کے ذریعے دیکھنے کو ملا بعض اسے نسخہ عرشی زادہ کا نام دیتے ہیں کچھ نے نسخہ امروہہ کہا کچھ اسے غالب کی نو دریافت بیاض کا نام دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سمجھتے ہیں:

''نو دریافت بیاض غالب'' کے سلسلے میں صرف تاریخی حثیت نہیں بلکہ تنقیدی نقطہ نظر سے بھی نہایت اہم دستاویز قرار پائی ہے''

''عملی تنقیدیں'' کا آٹھواں مضمون ''جگر مرادآبادی اور اردو غزل میں ان کا مرتبہ'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں جگر مرادآبادی کی شاعری کا بھر پور جائزہ لیتے ہوئے فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''جگر کے قبول عام کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کی شاعری ان کے دوسرے معاصر غزل گو شعراء کے مقابلے میں زیادہ عام فہم ، ہیجان پرور، ذود اثر ، رنگین اور حسین تھی اسی لیے دوسرے کلام کی بہ نسبت ان کی غزلوں سے لطف اندوز ہونا آسان تھا بیسویں صدی کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے

جگر کی مقبولیت کے امکانات ہمیشہ روشن رکھے گا''۔

کتاب کا نواں مضمون ''امام بخش ناسخ اور ان کا فن'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

''ناسخ کے معاصر غزل گو شعراء میں غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، حکیم مومن خان مومن اور حیدر علی آتش کے نام خاص طور پر آتے ہیں۔ ان تمام اہم شعراء نے کسی نہ کسی صورت میں امام بخش ناسخ کے کمالات فن کا اعتراف کیا ہے۔ ناسخ کے بہت سے اشعار زبان زد عام ہیں بعض اشعار تو ضرب المثل کی حیثیت سے ہمارے ادب کا حصہ بن چکے ہیں مثلاً

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

''عملی تنقیدیں'' کا دسواں مضمون ''جگر لخت لخت'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ ''عملی تنقیدیں'' اس کتاب کا دوسرا باب ''داستان اور افسانہ'' کے بارے میں ہے اس سلسلے میں پہلا مضمون ''داستان کا فن اور داستانیں'' ہے۔

جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ داستان کا لفظ بڑا ہمہ گیر ہے اور ادبی داستانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قصے کے تمام اقسام شامل ہیں۔ اردو فارسی میں کہانی، قصہ، افسانہ اور داستان ایک ہی مضمون میں استعمال کیے جاتے ہیں گویا ایک ایسی کہانی جو تخیل و تصور

کی تخلیق کی ہوئی رنگین فضا سے تعلق ووابستگی رکھتی ہو، وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہونے کی حیثیت سے ہمیں زمانہ قدیم و بعید کے انسان کی یاد دلاتی ہو، داستان کے فن کے بارے میں پوری آگاہی کے لیے فرمان صاحب کے مضمون کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس باب کا دوسرا مضمون ''مثنوی گلزارنسیم اور اس کے ماخذ'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے اس سلسلے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اس میں گل بکاولی کا حصہ نظم کیا گیا ہے یہ قصہ نسیم کا طبع زاد نہیں ہے بلکہ پہلے سے اُردو میں موجود تھا جیسا کہ خود نسیم کے ان اشعار سے ظاہر ہے

ہر چند سُنا گیا ہے اس کو
اردو کی زبان میں سخن گو

وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں
اس مے کو دو آتشہ کردوں میں

یہ مضمون بڑا تحقیقی اور قابل مطالعہ ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑی تحقیق اور تفصیل سے اسے مکمل کیا ہے۔ اس باب کا تیسرا مضمون ''مغرب کی شاہکار نظموں میں افسانوی عناصر'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ

''دنیا کی تمام یونانی، اطالوی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی مشرق میں

سنسکرت، فارسی، عربی اردو اور ہندی غرض دنیا کی کوئی قدیم زبان وادب منظوم قصوں سے خالی نہیں ہے۔ دنیا کے تمام قصّے ایک ہی مرکز سے تعلق رکھتے ہیں اور عالمگیر انسانی برادری کو یگانت ذہنی کا پیغام سناتے ہیں''

اس باب میں احمد ندیم قاسمی اور علامتی افسانہ، امراؤ طارق کا پہلا افسانوی مجموعہ، بدن کا طواف شامل ہیں۔ یہ دونوں معروف افسانہ نگار اردو ادب کو اہم افسانوی سرمایہ عطا کر گئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان دونوں کے فن پر بھرپور طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ ''عملی تنقیدیں'' اس کتاب کا تیسرا باب ''تاریخ وثقافت'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔

جس میں کل نو مضمون شامل ہیں خودی اور اسلامی تصوف، پاکستانی ثقافت کا خط عمودی یا افقی، تحریک پاکستان کا ثقافتی پس منظر، کلاسیکی ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ، سر سید احمد خان اور اکبر الہ آبادی، سر سید احمد خان اور موہن رائے، پاکستان کی دیگر زبانیں اور اردو، سید عابد علی عابد کا ثقافتی اور لسانی شعور، ہندوستان سے علامہ نیاز کی ہجرت ایک تاریخی واقعہ، یہ مضمون ماہنامہ نگار پاکستان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

جب کہ ''پاکستان کی دیگر زبانیں اور اردو'' کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون، ایک ہی رنگ و

نسل ،ایک ہی آسمان اور زمین ،ایک انداز فکر اور ایک ہی طرز کا رشتہ ہے۔دور حاضر سے لے کر قدیم تر زمانے تک سراغ لگاتے چلے جایئے یہ رشتے پوری طرح واضح ہوتے چلے جائیں گے صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف ورقیب نہیں بلکہ عزیز و رفیق ہیں ۔زبان سے زبان جنم نہیں لیتی بلکہ سماجی ،علاقائی اور معاشرتی ضرورتوں سے کبھی ایک اور کبھی بیک وقت کئی زبانیں وجود میں آجاتی ہیں"۔

"عملی تنقیدیں"اس کتاب کے آخری باب میں محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال پر ایک نظر ،رانی کیتکی کی کہانی اور انشاء اللہ خان ،خطبات عبدالحق پر ایک نظر ،نظیر اکبر آبادی اور ان کے ناقدین یہ تمام مضامین اہم عملی اور ادبی شخصیات کی اہم کتابوں پر تبصرے کے انداز میں تحریر کیے گئے ہیں جو اہم معلومات فراہم کرتے ہیں عملی تنقیدیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نہایت اہم تصنیف ہے جس کا مطالعہ ادب کے طالب علموں کے لئے نہایت مفید ہوگا۔

مطبوعہ ماہنامہ "الانسان" کراچی

فروری 2016

''نصف الملاقات'' ایک مطالعہ

دانشوروں کے خیال میں دنیائے علم وادب میں خطوط کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ انسان کا ذاتی فعل ہے جسے باقاعدہ فن کا اتنا درجہ نہیں دیا جاتا ہے جتنا کہ یہ اس کا حق دار ہے۔ خط کا اصل مقصد دل کی بات نوکِ قلم کے ذریعے دوستوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ دلی احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ دوستی اور خیر خواہی کا موزوں طریقہ ہے، فاصلے کی دوری کو عبور کر کے آپس کی گفتگو کا وسیلہ ہے۔ خطوط ماضی کا آئینہ دار ہوتے ہیں جن میں واقعات و حالات کی وہ جھلکیاں ہوتی ہیں جو مکتوب نویس کے دور میں نمایاں تھیں، ان کا دائرہ ذاتی مسائل سے لے کر زندگی کے ہر پہلو تک وسیع ہوتا ہے، ان میں خیالات کی تازگی بھی ہوتی ہے اور زبان وبیان کی شگفتگی بھی، ان میں علم وادب کا خزانہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے اور معلومات کا ذخیرہ بھی۔ ان میں علمی، ادبی، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی اور سیاسی وثقافتی پہلو بھی ہوتے ہیں۔

خطوط کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے بہت سے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے نہ صرف طرزِ تحریر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ علم وادب سے ان کا تعلق کو بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ مکتوبات کی تاریخ میں مکتوبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خطوط نہایت اہمیت کے حامل ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہم عصر سربراہانِ مملکت کی طرف روانہ فرمائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ مبارک نامے آج بھی محفوظ ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

خلفائے راشدین نے بھی خطوط کی روایت کو قائم رکھا۔ بعد کے دور میں حجاج بن یوسف کا راجہ داہر کو خط لکھنا بھی شہرتِ عام رکھتا ہے۔ حضرت مجدّد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے خطوط احیائے اسلام کے سلسلے میں نہایت اہمیت کے حامل تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مخدوم جہاں شریف الحق احمد یحییٰ منیری رحمتہ اللہ علیہ کے مکتوباتِ جو ''مکتوباتِ صدی'' کے نام سے مشہور ہیں، یہ مکتوبات بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مذہبی شخصیات کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی یہ روایت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

اردو میں مکتوباتی ادب کے حوالے سے مرزا رجب علی بیگ سرور، غلام غوث بے خبر، مولوی غلام امام شہید، نواب واجد علی شاہ، مرزا غالب، سرسید احمد خان، محسن الملک، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال، مہدی افادی، امیر مینائی، نذیر احمد، خواجہ حسن نظامی، سید سلمان ندوی، ریاض خیر آبادی،، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور دیگر اہلِ قلم کے مکتوبات کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ یہ سب ادب کے حوالے سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی:

''دوستوں، عزیزوں اور رفیقوں کے نام جو خط عام طور پر زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور روزمرہ پیش آنے والے حالات وواقعات کے ماتحت انکا رنگ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ تصنیف وتالیف کے فکر واہتمام سے انھیں کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی، نہ وہ سوچ بچار کر کے لکھے جاتے ہیں نہ ان میں کوئی دخل عبارت آرائی ہوتا ہے۔ نہ ان پر نوبت نظر ثانی کی

آتی ہے، پس جس طرح انسان بے تکلف اپنے بیوی بچوں، بھائی بندوں، دوستوں رفیقوں سے بات چیت کرتا ہے یہ نجی خط بھی اسی طرح سادہ زبان میں قلم برداشتہ لکھ دیے جاتے ہیں''۔

(حوالہ۔ دیباچہ مکتوباتِ سید سلیمان ندوی، جلد دوم)

یوں تو دنیائے ادب میں غالب کے خطوط کو اہم مقام حاصل ہے اور یہ رسم ہر دور میں جاری رہی۔ مشاہیر نے اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے کے لیے خطوط نویسی کا طریقہ بھی اختیار کیا، اس طرح مکتوبات کے بے شمار مجموعے اردو زبان میں شائع ہو چکے ہیں جن کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے ''خطوط نگاری'' کے عنوان سے اپنے مضمون مطبوعہ ''اصناف ادب نمبر'' نگار پاکستان کراچی میں لکھا ہے کہ:

''ادب کی تخلیقی اصناف مثلاً ناول، افسانہ، مثنوی یا نظم لکھتے وقت فن کار کے ذہن میں قارئین ہوتے ہیں لیکن خط لکھتے وقت دماغ میں نہ کوئی غول بیابانی ہوتا ہے، نہ کوئی محفل، ایک باتیں کرنے والا ہوتا ہے ایک سننے والا، اس عمل میں صرف دو انسانوں کی خودی بیداری ہوتی ہے۔ صرف دو انسان زندہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ساری دنیا غنودگی کے عالم میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی زندگی کے وہ سبک و دلکش اور نازک پہلو جو اس کے بلند ادبی کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے خطوط میں نمایاں ہو جاتے ہیں''۔

''نصف الملاقات'' مشاہیر کے خطوط ہیں۔ ان کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری

نے مرتب کیا ہے۔یہ خطوط ڈاکٹر صاحب کو لکھے گئے تھے۔خط لکھنے والوں میں علامہ نیاز فتح پوری ،مولانا ابوالکلام آزاد ،اثر لکھنوی ،ڈاکٹر سید عبداللہ،ڈاکٹر عبادت بریلوی ،ڈاکٹر مسعود حسین خان ،امتیاز علی تاج،میرزا ادیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی ،فراق گورکھپوری، پروفیسر آل احمد سرور، ،مولانا حامد حسن قادری ،مالک رام ،لطیف الدین احمد، جوش ملیح آبادی ، پروفیسر عبدالقادر سروری ،امتیاز علی عرشی، سید الطاف علی بریلوی ، پروفیسر گیان چند، حجاب امتیاز علی ، ڈاکٹر ابو محمد سحر،سید علی جواد زیدی ،مختار الدین احمد شامل ہیں۔ساتھ ہی ساقی جاوید ،خیر بہوروی ،شفا گوالیاری ، یوسف سرمست ،کوثر چاند پوری ،سید اختر علی تلہری اور جمیل مظہری کے خطوط مع سوانحی کوائف اس مجموعے کا حصہ ہیں۔

یہ خطوط ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے علمی ،ادبی ، تحقیقی اور تنقیدی دائروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یوں تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت ہر طرح مکمل اور بھرپور ہے لیکن ان خطوط سے اُن کی خطوط کے بارے میں سلیقہ مندی کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔اس لیے کہ جس شخص کے پاس بے شمار خط آتے ہوں اس کے لیے باقاعدہ اور مستقل خط و کتابت کرنا ایک مشکل کام ہے اور ان خطوط کا جواب تحریر کرنا اور بھی مشکل ہے۔خط لکھنا اور آنے والے خطوط کو ترتیب سے رکھ کر ان کے جواب لکھنا ایک منظم شخصیت ہی کے بس کی بات ہے جس سے زندگی کے نظم و ضبط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''نصف الملاقات'' ایک ایسا مجموعہ مکتوبات ہے جس میں ہمیں مکتوب

نویسوں کے کوائف بھی مل جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک طرح کا تذکرہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ نیاز فتح پوری کے خطوط سے پہلے اُن کے بارے میں لکھا ہے:

"نیاز فتح پوری سے پہلی بار ۱۹۴۸ء میں ان کے گھر پر لکھنؤ میں ملا۔ اسی سال میں اُنھیں مسلم ہائی اسکول کے سالانہ مشاعرے کی صدارت کے لئے فتح پور لے گیا۔ اسی طرح ان سے ملنے اور بعدازاں مراسلت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ ۱۹۵۰ء میں، میں کراچی چلا آیا تو شاید دورِ افتادگی کے سبب اُن سے حصول قریب کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ چناں چہ میں کبھی ضرورتاً اور بیش تر بے ضرورت اُنھیں خط لکھتا رہتا وہ مجھے ہر خط کا بہت خوبصورت اور حوصلہ افزا جواب دیتے۔ میرے پاس ان کے مکتوبات خاصی تعداد میں جمع ہوگئے لیکن سارے خطوط محفوظ نہ رہے۔ بہرحال جو بھی ہیں نذرِ قارئین ہیں"۔

نیاز فتح پوری کا خط بنام ڈاکٹر فرمان فتح پوری

لکھنو ۲۹ جنوری ۱۹۶۰

عزیزم! مضمون مل گیا، مارچ میں شائع ہوگا۔ آپ اپنے مقالوں میں ایجاز و اختصار کا خیال زیادہ رکھیے۔ وسیع مفہوم کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنا ادب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ آپ نے اس مقدمہ کا

حال نہیں لکھا۔ خدا کرے حسبِ مراد طے ہو گیا ہے۔

(نیاز)

یہ مختصر مگر نہایت اہم خط فرمان فتح پوری صاحب کے لیے کس قدر کار آمد ہے۔ اس کا اندازہ چند سطور سے لگانا آسان ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطوط سے پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب لکھتے ہیں:

''اردو کے صاحبِ طرز انشاء پرداز، بلند پایہ مزاح نگار طنز نویس۔ صف اول کے ناقد اور خاکہ نگار، غالب کے سخن فہم و اقبال کے رمز شناس بیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کے علم برادر اور استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کو میں نے اُن کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''خنداں'' اور ادبی خاکوں کے مجموعے ''گنج ہائے گرانمایہ'' کی معرفت زمانہ طالب علمی میں پہچانا، پھر یہ پہچان ذہن و قلب پر ایک مستقل نشان بن گئی''۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا خط بنام ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

علی گڑھ یونیورسٹی

۱۵۔ جون ۱۹۵۱ء

محترمی! گرامی نامہ مورخہ ۹ جون ملا۔ ''ماہِ نو'' کے لیے میں نے حسرت پر ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے۔ جسے عنقریب بھیج دوں گا۔ آپ اربابِ ''ماہِ نو'' سے اس بارے میں گفتگو فرما کر اپنے مطلب کی بات

طے فرما لیجیے۔

خاکسار

(رشید احمد صدیقی)

مولانا امتیاز علی خاں عرشی عربی و فارسی کے نامور عالم اور پشتو اور پنجابی کے بھی رموز شناس تھے۔ اُن کا شمار اردو کے بڑے محققوں میں ہوتا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی کا خط بنام ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

دی اسٹیٹ لائبریری

رامپور اسٹیٹ، یو پی، بھارت

۱۹ جون ۱۹۵۱ء

محترمی، تسلیم! آپ کا والا نامہ ملا، حسرت مرحوم کے سلسلے میں آپ کے ارادے بہت مبارک اور مستحق آفرین ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہماری دنیا مردہ پرست ہے۔ حسرت نے اردو غزل کو دوبارہ جو زندگی بخشی ہے اگر ملک و قوم کو قدر و منزلت کرنا آتی تو اس کے صلے میں حسرت کو اس کی حیات ہی میں ملکِ ادب کا بادشاہ تسلیم کر لیتی۔ بہرحال اگر اب بھی اس کے کام کی قدر کر لی جائے تو غنیمت ہے۔ میں اپنی بے حد مصروفیت کے باعث اُس مہم میں شرکت نہیں کر سکتا، مگر آپ کی کامیابی کے لیے دستِ بدعا ہوں۔ والسلام

مخلص

(عرشی)

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا شمار بیسویں صدی کے نامور ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کراچی میں ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے اثر لکھنوی کو کئی خط لکھے اور اثر لکھنوی صاحب نے اُن خطوط کے جواب دیے یوں فرمان صاحب او ر اثر لکھنوی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا، ایک خط یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

کشمیری محلّہ

۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء

مکرمی۔ تسلیم!

یاد آوری کا شکریہ۔ پرمٹ وغیرہ کا انتظام ہو گیا تو حاضری کی کوشش کروں گا تا کہ لوگوں کو کافی وقت ملے۔ ۱۶ فروری مشاعرے کے لیے مناسب تاریخ ہوگی۔ آئندہ جو آپ کی مصلحت۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ کراچی کی سیر کرلوں اور احباب کو دیکھ لوں۔

نیاز مند

(اثر)

جوش ملیح آبادی کا شمار اردو کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ انھیں شاعر انقلاب اور شاعر شباب بھی کہا جاتا ہے۔ مختلف اور متضاد رنگوں میں شاعری کے اعلیٰ نمونے ان کی ذہانت طباعی اور خلاقانہ صلاحیتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اقبال کے بعد اردو میں بہترین نظم نگاری کے نمونے جوش کے ہاں ملتے ہیں۔ وہ الفاظ ، تشبیہات اور استعاروں کے بادشاہ تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور جوش

صاحب کے درمیان کافی عرصہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، ایک خط یہاں بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی

۱۰ فروری ۱۹۵۵ء

حضرت! غضب ہی کر دیا۔ آپ نے میرے شعر میں ایک غلط لفظ داخل اور صحیح لفظ خارج کر کے خود اس پر اعتراض کر دیا۔ بندہ پرور میں نے کہا ہے:

"رسمِ عالَم پر نہ جا، دیکھ اپنی افتادِ مزاج"

آپ نے "مزاج" کو "طبع" کر دیا اور یہ غور نہ فرمایا کہ ایسی جاہلانہ غلطی کا میں کیوں ارتکاب کر سکتا تھا۔

نیاز مند

(جوشؔ)

فراق گورکھپوریؔ، جوشؔ اور جگر کے ہم عصر ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں غزل کے روایتی مضامین سے لے کر سیاست، سماجی کشمکش اور کرب کا ردِ عمل بھی کچھ پیش کیا ہے۔ غزل کے سراپے میں انھوں نے انسانی حسّیات، کیفیات اور نفسیات کی ہم رنگی سے بڑے دل آویز نقوش قائم کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے غزل کی نشاۃ ثانیہ میں اہم ترین کارنامے انجام دیے ہیں۔ فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے درمیان طویل عرصے تک خط کتابت رہی۔ فراق کے کافی خطوط فرمان صاحب کے پاس موجود ہیں جن میں سے کچھ کتابی صورت

میں شائع ہو چکے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک خط دیکھیے :

۸\۴ بینک روڈ، الہٰ آباد

۸ جنوری ۱۹۶۳ء

محبی و مکرمی !

شرمندہ ہوں کہ آپ کے اور عزیزی قمر نیازی کے خلوص ناموں کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ حضرت نیاز سے میرا سلام کہیے۔ جب تک میرے دم میں دم ہے نگارِ پاکستان کے لیے اپنی ناچیز نگارشات بھیجتا رہوں گا۔ مرسلہ نظم میں ایک شعر کا دوسرا مصرعہ یوں تحریر ہو گیا۔

"کہ زندگی کو ہے اے دوست زندگی درکار"

میں سمجھتا ہوں کہ "اے دوست کا" ٹکڑا نکال کے "دراصل" کا ٹکڑا رکھ دیا جائے۔

آپ کا

(فراقؔ)

مولانا حامد حسن قادری معلّم و ادیب تھے۔ مورخ و تاریخ گو تھے اور علمِ عروض و بدیع کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور اردو ادب سب پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ اُن کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تاریخ مرثیہ گوئی، نقد و نظر، تاریخ و تنقید ادبیات انکی اہم تصنیفات ہیں۔ داستانِ تاریخ اردو ان کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ مولانا حامد حسن قادری اور ڈاکٹر فرمان فتح

پوری کے درمیان برسوں خط و کتابت رہی ایک خط بطور نمونہ دیکھیے :

۱۳ \ ۴۶، ایسٹ جہانگیر روڈ عقب تھانہ نیو ٹاؤن، کراچی نمبر ۵

۲۴۔ جنوری ۱۹۵۵ء

جناب مکرم۔ اسلام وعلیکم

آپ کا کارڈ آگرہ سے کل یہاں پہنچا۔ میں ۱۵ جنوری کو ہجرت کرکے آگیا۔ اب ملاقات ہوا کرے گی۔ مشہور محاورہ "ڈون کی لینا" ہے۔ شان، ناز، نخرے کی کوئی سند نہیں۔ لیکن میری رائے میں اب محاورات میں بھی وسعت ہونی چاہیے۔ اس محاورے کی بنیاد (کی لینا) ہے اس مفہوم کو ہر اُس لفظ کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں جس میں خود ستائی اور اکڑ پائی جائے۔ اس میں کیا حرج ہے۔

احقر

(حامد حسن قادری)

مولانا ابو الکلام آزاد برعظیم پاک و ہندی کی تحریکِ آزادی کے علم بردار اور کانگریس کے غیر معمولی رہنما تھے۔ وہ صاحبِ اُسلوب نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ صحافت و سیاست کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی کرتے تھے۔ فرمان صاحب نے رباعی کے سلسلے میں مولانا کو خط لکھا جس کا جواب کچھ اس طرح آیا:

۴۔ کنگ ایڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء

جناب محترم تسلیم !

ا۔ رباعی کے متعلق آپ کا خیال درست ہے۔

۲۔ جو دو رباعیاں آپ نے لکھی ہیں ان میں سے ایک حضرت مولانا کی ہے۔

"تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی"

اور کوئی رباعی جدید نہیں کہی۔

زیادہ نیاز

محمد اجمل پرائیوٹ سیکریٹری

کوثر چاند پوری بھوپال کے رہنے والے تھے، شعروادب کے حوالے سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ماہنامہ نگار کے لیے انھوں نے بہت سے مضمون لکھے جو نگار میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام لکھے گئے خطوط میں سے ایک خط اس طرح ہے۔

بدھ وارا، بھوپال

۱۲۔ نومبر ۱۹۶۲ء

جناب محترم تسلیم!

آپکے گرامی نامے کا جواب فوراً ہی دے دیا تھا۔ حسب وعدہ ایک مضمون "علامہ نیاز فتح پوری شخصیت اور فن کے آئینہ خانے" میں ارسال کر رہا ہوں۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔ نیاز صاحب کو دیکھا دیں۔ میں اس کی رسید اور آپ کی نیز نیاز صاحب کی تفصیلی

رائے کا منتظر رہوں گا۔

نیاز کش

کوثر چاند پوری۔ بھوپال

یوسف سرمست کا شمار بھی اردو کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔اپنے خط میں فرمان فتح پوری صاحب کو لکھتے ہیں:

سی ۳ تھرڈ فلور

شکھ مانی اپارٹمنٹ ،لکڑی کا پل ،حیدر آباد ، بھارت

۲۰۔اپریل ۱۹۸۳ء

محترم۔تسلیم!

بہت دنوں بعد ایک مضمون لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہورہا ہوں ۔بیچ میں کچھ ایسے حالات ہوئے کہ پاکستان کے رسالوں کے لیے لکھنا ممکن نہ ہوسکا۔ادھر پاکستان کے رسالے ملنا بھی محال ہوگیا ۔لیکن اب پھر یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ خدا کرے ہمیشہ قائم رہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے تعلق سے اب بھی بعض غلط فہمیاں عام ہیں ۔مثال کے طور پر انھیں غزل کا مخالف سمجھ لیا گیا ہے حالاں کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے ۔میں نے اپنے مضمون ''حالی اور جدید غزل''میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔امید ہے کہ مضمون پسند آئے گا اور آپ اپنے موقر رسالے میں شائع کر کے ممنون فرمائیں گے۔

مخلص

(یوسف سرمست)

پروفیسر آل احمد سرور کا اردو زبان وادب، شاعری، تنقید نگاری، انشاپردازی کے حوالے سے بڑا مقام ہے۔ان کی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں اُنھیں حکومتِ ہند کی جانب سے ''پدم بھوشن'' کا اعزاز مل چکا ہے۔ساتھیہ اکادمی ایوارڈ، اُتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ، غالب مودی ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور اقبال سمان ایوارڈ بھی انھیں مل چکے ہیں۔ان کی تصنیفات کی فہرست بھی خاصی بڑی ہے۔پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے درمیان طویل عرصے تک خط و کتابت رہی، اُنکے خطوط میں سے تین خط اسی کتاب کا حصہ ہیں۔ایک خط سے اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

۲۴۔اگست ۱۹۶۷ء

مکرمی فرمان صاحب۔تسلیم!

آپ سے ایک فرمائش کرنا ہے۔مجھے ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' اور ''محمد حسین آزاد'' از: ڈاکٹر اسلم فرخی بھیج دیجیے۔

نیاز مند

(آل احمد سرور)

مالک رام کا شمار اردو کے محقق کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مالک رام کے درمیان خط وکتابت کا دورانیہ بھی

خاصہ طویل ہے۔ ''نصف الملاقات'' میں مالک ارم کے کئی خط شائع کیے گئے ہیں، ایک خط کا کچھ حصہ دیکھیے ۔

۴-۵۰ سی ڈیفنس کالونی

نئی دلی ۱۱۰۰۲۴

۴۔ جون ۱۹۸۱ء

محبّ مکرم! اگر محض خواہشوں اور تمناؤں پر حصولِ ثواب ونجات کا مدار ہو تو ہم میں سے کسی کو اپنی عاقبت کے بارے میں شبہ نہ رہتا۔ لیکن فیصلہ تو اعمال سے ہوگا اور یہ کرنے ہی سے ہوں گے۔ خداتعالیٰ آپ کا حامی و ناصر رہے۔ آمین والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

ساقی جاوید اردو نظم و غزل کے معروف شاعر تھے، ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر ''چاند میری زمیں'' اور آشوب روزگار'' خاص طور پر مشہور ہوئے۔ ان کا سلسلہ خط و کتابت بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ساتھ قائم تھا۔ ایک خط کی چند سطور ملاحظہ فرمائیے۔

۱۷۔ ستمبر ۱۹۶۷ء

بھائی فرمان صاحب

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

میں نے آپ کو جو دو نظمیں روانہ کی تھیں اُن کا کیا حشر ہوا۔ایک تو شاید شائع ہوگئی تھی لیکن ''معبودِ فکر'' کو شاید آپ نے رڈی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔خط کا جواب ضرور دیجیے۔کوئی مضائقہ نہیں بیرنگ ہی سہی۔

فقط آپ کا

ساقی جاوید

ڈاکٹر عبادت بریلوی وسیع النظر اور وسیع القلب انسان تھے۔بحیثیت نقاد انھوں نے بہت شہرت پائی۔بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔فرمان صاحب پر بہت مہربان تھے۔اُن سے بڑی محبت کرتے رہے اور دونوں کے درمیان طویل عرصے تک خط کتابت جاری رہی۔فرمان فتح پوری کے پاس ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بہت سے خطوط ہیں۔مگر کتاب میں صرف تین خط شائع کیے ہیں۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۱۶۔ستمبر ۱۹۷۰ء

برادرم فرمان صاحب۔اسلام وعلیکم!

یہ خط ایک ضرورت سے لکھ رہا ہوں،آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تاریخِ ادبیات کی اس جلد کے لیے جس کو میں مرتب کر رہا ہوں آپ تذکروں کے متعلق مضمون لکھ دیں گے۔آپ تھوڑا سا وقت نکال کر یہ مضمون لکھ دیجیے ممنون ہوں گا۔میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

آپ کا

عبادت بریلوی

سید امتیاز علی تاج نے درجنوں کتابیں لکھیں، کئی رسائل سے بھی وابستہ رہے، انگریزی اور فرانسیسی ڈراموں کے ترجمے بھی کیے اور ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام خط میں لکھتے ہیں:

مجلسِ ترقیِ ادب۔۲ کلب روڈ، لاہور

۱۶۔مارچ ۱۹۷۰ء

محترمی و مکرمی فرمان فتح پوری صاحب، سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔حسب الارشاد مجلس کی کتابیں تبصرے کے لیے ارسالِ خدمت ہیں۔ان پر تبصرہ شائع ہو گیا تو اور کتابیں بھی بھیج دی جائیں گی۔

خاکسار

سید امتیاز علی تاج

حجاب امتیاز علی تاریخی اور فنی اعتبار سے اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ان سے خط کتابت بھی فرمان صاحب کے ساتھ رہی۔

مرزا ادیب مشہور ادبی رسالہ ''ادب لطیف'' کے مدیر تھے۔ان کے ڈراموں کے مجموعے شخصی خاکے، تنقیدی مقالات اور افسانے، خودنوشت اور دیگر تصانیف اردو ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پاس مرزا ادیب کے درجنوں خطوط محفوظ ہیں۔چند خطوط اس مجموعے میں شائع کیے ہیں۔

لاصحرا۔ چوہان روڈ

کرشن نگر۔ لاہور

۲۲۔ دسمبر ۱۹۸۹ء

محبّ گراں قدر۔ سلام مسنون

میں اپنے فرمان فتح پوری کی اس کوشش کی دل و جان سے تعریف کرتا ہوں کہ ان کی ادارت میں نگار کا ہر شمارہ ایک خصوصی شمارہ بن گیا ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ہندوستانی ناقدین کے نئی تنقید سے متعلق مضامین شائع کر دیے ہیں۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

آپ کا

مرزا ادیب

پروفیسر گیان چند جین کی بہت سی کتابوں نے شہرت پائی۔ مثلاً ''اردو کی نثری داستانیں''، ''تحقیق کا فن''، ''تحریریں''، ''ادبی اصناف''، ''اردو مثنوی شمالی ہند میں''، ''مقدمے اور تبصرے''، ''تفسیر غالب''، ''لسانی مطالعے''، ''تجزیے''، ''کھوج''، ''اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک''، ''رموز غالب''، ''پرکھ اور پہچان'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

مجی ڈاکٹر فرمان صاحب۔ تسلیم

نگار کے کئی شمارے ملے۔ تاریخ گوئی سے متعلق شمارہ میرے لیے نہایت مفید ہے۔ اسے کچھ پڑھ لیا ہے، بقیہ پڑھ لوں گا اور حفظ کرنے کی کوشش

کروں گا۔

مخلص

گیان چند

اردو زبان وادب کے بلند پایہ معلم ،ممتاز ماہر تعلیم ،محقق اور نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ کی پوری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت میں گزری ۔ان کی کتابوں نے بھی خوب شہرت پائی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے اُن کی خوب خط و کتابت رہی ۔ایک خط ملاحظہ فرمایئے۔

ادارہ ادبیاتِ پاکستان

۱۷۔اردو نگر۔ملتان روڈ

۱۳ دسمبر ۱۹۸۲ء

مکرمی ومحترمی ۔اسلام وعلیکم

آپ کا ۲ دسمبر ۱۹۸۲ء کا لکھا ہوا گرامی نامہ ملا۔مضمون آپ کو مل گیا ہے۔اس سے اطمینان ہوا۔آپ نے مضمون پسند کیا ہے اس کے لیے شکرگزار ہوں۔والسلام

نیاز مند

سید عبداللہ

ڈاکٹر ابو محمد سحر ممتاز محقق و نقاد تھے ۔اردو زبان و ادب کے کئی شعبوں میں اُنھوں نے بلند پایہ کام کیا۔شعر بھی کہتے تھے اور لغت نویسی و مسائل زبان سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے ان کی متعدد تحقیقی وتنقیدی کتابوں میں چند کے

نام یہ ہیں۔ ''مطالعہ امیر، تنقید و تجزیہ''، ''اردو میں قصیدہ نگاری''، ''زبان و لغت''، ''انتخاب قصائدِ اردو''، '' اردو املا اور اس کی اصلاح ''، ''غالبیات کے چند مباحث'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے درمیان طویل عرصے تک خط و کتابت رہی۔ ایک خط دیکھیے۔

بھوپال

۱۷۔ مئی ۱۹۸۵ء

محبِ مکرم تسلیم!

چند دن ہوئے آپ کی گرانقدر تصنیف ''اردو املا و رسم الخط'' موصول ہوئی بے حد ممنون ہوں۔ ہائیہ دو حرفوں کو آپ نے بھی حروفِ تہجی میں شمار کر لیا ہے۔ اس پر اور سوچیے گا۔ ہائے مخلوط کو میں بھولا ہوا تھا۔ میرے مضمون ''دوچشمی ہے'' کی اشاعت کی گنجائش کس طرح نکلے گی؟ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

ابو محمد سحر

ڈاکٹر مسعود حسین خان کا شمار اردو کے ممتاز اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لسانیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ آپ کی ایک درجن سے زیادہ تصنیفات و تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کے درمیان برسوں خط و کتابت رہی، ''نصف الملاقات'' میں ڈاکٹر مسعود حسین خان

کے کئی خطوط شامل ہیں۔ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

جاوید منزل، جامعہ اردو، روڈ

ڈاڈ پور، علیگڑھ ۲۰۲۰۰۱

برادرِ مکرم، تسلیمات!

آپ تو ایک بار پھر تدوینِ لغت میں غوطہ زن ہو گئے ہوں گے۔ بہت بڑا اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔لغت نویس کو جیتے جی صلہ نہیں ملتا، لیکن بعد کو بقائے دوام کے دربار میں اس کی نشست محفوظ ہو جاتی ہے۔ایک بار پھر آپ کے خلوص و محبت کا شکریہ۔

آپ کا مخلص

مسعود حسین

''نصف الملاقات'' میں سید اختر علی تلہری ،لطیف الدین احمد، عبدالقادر سروری، شفا گوالیاری ، خیر بہوروی، جمیل مظہری، حجاب امتیاز علی ، سید الطاف علی بریلوی، علی جواد زیدی اور مختار الدین احمد کے خطوط بھی شامل ہیں۔ جو اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تمام مکتوب نویسوں کے حالات اور ہر ایک سے اپنے تعلق کو پوری طرح بیان کیا ہے۔

وقت اور ترقی کے ساتھ ساتھ خط نے بھی اپنی ہیت یعنی شکل صورت بدل لی ۔جب تحریر ایجاد نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی خطوط یا مکتوبات اپنی اولین صورت ''تصویری خط'' دور رہنے والوں کے درمیان ایک دوسرے کی بات کو پہچانے کا ذریعہ تھا۔ زمانے نے کروٹ لی ۔نئی ایجادات یعنی کمپیوٹر ،انٹرنیٹ ،

موبائل اور ابلاغ عامہ نے فاصلوں کو سمیٹ کو رکھ دیا۔ خطوط لکھنے اور بھیجنے کا رواج دم توڑتا جا رہا ہے۔ شاعروں، ادیبوں کے مابین مکتوبات کا جو تبادلہ ہوا کرتا تھا ان میں بڑی حد تک کمی آ گئی ہے تاہم یہ روایت کم کم ہمیشہ برقرار رہے گی۔ ''نصف الملاقات'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک عمدہ کتاب ہے جو سوانحی کوائف پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور تذکرہ کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی

جولائی 2013

''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' ایک مطالعہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' پہلی بار ۲۰۰۶ میں الوقار پبلی کیشنز لاہور کی معرفت شائع ہوئی۔ یہ دونوں شاعر ہم عصر اور ہم فن تھے۔ پہلا حصہ جوش ملیح آبادی کے بارے میں ہے۔ دونوں نے اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا دونوں میں ہم عمری اور ہمعصری کے ساتھ ساتھ اور بھی مشترک اوصاف تھے جن کی جانب مصنف ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے توجہ دلائی ہے۔ فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''جوش و فراق دونوں میں ہم عمری اور ہم عصری کے علاوہ بھی کئی پہلو باہم مشترک ہیں۔ دونوں اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے اور انیسویں صدی کی نویں دہائی میں وفات پائی۔ شاعری کے ساتھ دونوں نے اُردو نثر کی طرف اپنی توجہ صرف کی چنانچہ ''اشارت'' سے لے کر ''یادوں کی بارات'' تک جوش نے اردو نثر کو ایسا خوبصورت و دل نشین پیرائیہ اظہار دے دیا ہے کہ اُن کی کتابوں کے مواد کے بعض اجزاء سے اختلاف کے باوجود ان کے سادہ اور پُرکار اسلوب کی داد ہر صاحبِ ذوق کو دینی پڑتی ہے۔ فراق کی بھی یہی صورت ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو اپنی تنقید کے ذریعے فکر انگیز اور مدلل پیرائیہ بیان دے کر اردو کی تنقیدی نثر کو حد درجہ باوقار اور باوقعت بنا دیا ہے''

مندرجہ ذیل تعارف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوش اور فراق میں

کس حد تک گہرا تعلق تھا کتاب کا پہلا مضمون ''جوش انقلابی سوچ کے حوالے سے'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ بلاشبہ جوش انقلاب پسند شاعر تھے۔ ان کا نعرہ انقلاب میں للکار اور رجز کا انداز پوری طرح جلوہ گر ہے۔ انھوں نے خطابیہ انداز میں قوم کو بیدار کرنے کی پوری کوشش کی شکستِ زنداں کا خواب، غلاموں کی بغاوت، ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام اور نظامِ نو، اسی قسم کی نظمیں ہیں جن سے ان کی انقلاب پسندی کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''جوش کی شاعری یک رخی نہیں بہت پہلودار ہے۔ رنگا رنگ اور ہمہ گیر ہے۔ جوش نے جس فضا میں شعور کی آنکھ کھولی اور اپنی شاعری کا آغاز کیا اس میں اقبال کے علاوہ متعدد بڑے شاعروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جوش بھی اقبال ہی کی طرح حساس طبیعت اور مفکرانہ ذہن رکھتے تھے۔ ملک و قوم کی سیاسی و سماجی زبوں حالی پر کڑھتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے میں خاص قسم کی تبدیلیاں دیکھنے کے متمنی تھے''۔

جوش کہتے ہیں:

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل، میری جلو میں قتلِ عام
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار
بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے شہ سوار

جوش کے اشعار بڑے جاندار اور پُر اثر ہیں۔ ان میں الفاظ کی بڑی

شان وشوکت اور گھن گرج ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب برطانوی سامراج اور ہٹلر کے ظلم وستم کی انتہا ہوگئی تو جوش پکار اٹھے۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقاء

باغ انسانی میں چلنے ہی کو ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے اس مضمون جوش انقلابی سوچ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

"شاعری میں دراصل اسی طرزِ سخن سرائی کا نام انقلابی سوچ اور لہجہ ہے اور اسی سوچ اور اسی لہجے کے سبب کہنا پڑتا ہے کہ جوش محض رومانی نہیں بلکہ انقلابی سوچ کے شاعر بھی ہیں۔ جوش کی سوچ کی رومانی اور انقلابی روش انکے یہاں جوانی سے لے کر آخری عمر تک یکساں کارفرما رہی"۔

جوش نے کیا خوب کہا:

اس زمیں پر موتیوں اور آنسوؤں کے درمیاں
مدتوں سے چل رہا ہے زندگی کا کارواں

کتنی صبحیں پل چکی ہیں گلشنِ آفاق میں
کتنی شامیں جل چکی ہیں روز و شب کے طاق میں

کتنے ایوانوں کے آگے جھک چکی ہے زندگی
کتنے تخت اپنے سروں پر رکھ چکا ہے زندگی

گویا کہ جوش کے ایک ایک شعر سے ان کی صدا احتجاج سنائی دے رہی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پوری دیانت داری سے اپنے مضمون میں جوش کی انقلابی سوچ کی وضاحت کی ہے۔

''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' اس کتاب کا دوسرا مضمون ''جوش کی غزل گوئی'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔جوش کو عام طور پر غزل کا مخالف کہا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوش میں غزل گوئی کا بڑا سلیقہ تھا اسی لیے انھوں نے ابتداء میں بہت خوبصورت غزلیں کہی ہیں ،مثلاً ان کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں۔

تمہیں آہیں سننے کا بہت شوق تھا مگر اب بتاؤ کرو گے کیا
جو کراہتا تھا تمام شب وہ غریب خوش تو مر گیا

وہ عجیب جن کے رمز تھے یہ نرالے ناز کے بھید تھے
وہ نقاب اُٹھا کر جو آ گیا کوئی جی گیا کوئی مر گیا

جو بہار ملتی تو پوچھتا کہ کہاں وہ کیف نظر گیا
وہ صبا کی شوخیاں کیا ہوئیں وہ چمن کا حسن کدھر گیا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون ''جوش ملیح آبادی کی غزل گوئی میں''
لکھتے ہیں:

''ان کی غزل میں وہ کلاسیکی حسن بھی ہے جو حسرت، جگر، اصغر اور فانی
کے یہاں ملتا ہے اور وہ لب ولہجہ جو جوش ملیح آبادی کی شاعری کے
لیے مخصوص ہے۔غزل کا یہ نرم عمومی آب و رنگ جوش کی غزلوں میں
ان کے عہد کی مروجہ غزل کے زیر اثر آیا ہے''۔

جوش کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

خواب کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''جوش غزل کے مزاج کے دشمن نہیں تھے۔ وہ معنی کی سطح پر غزل کو نظم جیسی اور نظم کو غزل جیسی اثر پذیری دینا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کا مزاج سراپا تغزل تھا، البتہ ان کے دل و دماغ میں اس تغزل کی لہریں اتنی دوررس بلند آہنگ اور پُر خروش تھیں کہ غزل میں ان کی سمائی مشکل تھی انھیں طویل نظموں کا سہارا لینا پڑا''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اہم تصنیف ''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' کا تیسرا مضمون ''جوش ملیح آبادی رباعیات کی روشنی میں'' کے عنوان سے قلم بند کیا گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے نظموں کے ساتھ ساتھ رباعیات میں بھی کمال حاصل کیا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''جوش نے اپنی رباعیات سے اردو شعراء کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ بعض ہم عصر بڑے شاعر بھی رُباعی کی طرف رجوع ہوئے۔ جوش کی رباعیاں حسن و عشق سے لے کر دورِ حاضر تک کہ جدید رجحانات و مسائل کی ترجمان بن گئی ہیں۔ ان کا لب و لہجہ ان کی نظموں کی طرح انقلابی اور ان کے سوچنے کا انداز باغیانہ اور ان کا طرز بیان پُر جوش ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسی گہری سنجیدگی ایسی فلسفیانہ گہرائی اور اندازِ بیان میں ایسا لطیف ٹھراؤ بھی مل جاتا ہے جو علامہ اقبال کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے''۔

مثلاً چند رباعیات ملاحظہ کیجیے:

دل ہوتا ہے رو برو آہ گا ہے گا ہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گا ہے گا ہے
اس ڈر سے خودی خدا نہ بن جائے کہیں
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

☆☆☆

گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
بد قسمت گھٹا ہے لڑ کھڑاتا ہوا چل
کل خاک میں مل جائے گا یہ زورِ شباب
جوش تو آج بانکپن دکھاتا ہوا چل

جوش کی بعض رباعیوں میں بڑی رندی اور سرمستی کا اظہار ہے انکی رباعیات پڑھ کر عمر خیام کی یاد تازہ ہوجاتی ہے دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

ساقی کا پھر رنگ نظارہ کر لوں
مرتے مرتے بھی اک اشارہ کرلوں
آدم کا میں نا خلف ہوں فرزند اے جوش
عصیاں سے اگر کبھی کنارا کرلوں

مرضی ہوتو سولی پہ چڑھانا یا رب
سو بار جہنم میں جلانا یا رب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''جوش کی رباعیوں میں بڑی رنگارنگی اور ہمہ گیری ہے۔ اُنھوں نے تصوف ، فلسفہ ، رموز فطرت ، اسرار حقیقت ، عرفان ذات ، شراب ، اس کے لوازم و اثرات ، شباب رندی اور اس کی کیفیات ، فطرت اور اس کے مظاہر و عوامل ، الہوئیت اور اس کے معجزات ، انسان اور اس کے نفسیاتی رموز ، احساس اور اسکی لطافت ، مذہب اور اس کے اثرات ، طبقاتی زندگی اور اس کی کشمکش اور مختلف علوم و فنون کے گوناگوں تصورات کو ایسے فنکارانہ انداز سے رباعی میں قلم بند کیا ہے کہ نظم و غزل کی طرح اردو رباعی کا دامن بھی ان کی بدولت وسیع ہوگیا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ جوش کی نظموں کی طرح ان کی رباعیات بھی مختلف موضوعات کو اپنے اندار سمیٹے ہوئے ہیں ۔ جوش کی رباعیات ان کے شاعرانہ مقام و مرتبے کو بلند کرتی ہیں ۔ حُسن عشق کے باب میں بھی ان کی رباعیاں اپنی مثال آپ ہیں ۔ کیا خوب کہا:

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کے مرے زانو پہ سویا ہے ابھی
رو رو کے سحر کو روکے کوئی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' کا چوتھا مضمون ''جوش ملیح آبادی اور نیاز و نگار'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔

اس مضمون میں فرمان صاحب جوش صاحب اور علامہ نیاز کے تعلقات کے بارے میں دونوں حضرات کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نیاز فتح پوری عمر میں جوش سے کم و بیش چودہ سال بڑے تھے۔ پھر بھی دونوں ہم عصر کہلاتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ دونوں کی زندگی کے سیاسی و سماجی حالات اور ان حالات کی تبدیلیوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔ دونوں خلاق ذہن کے مالک تھے اور دونوں نے اردو زبان اور ادب پر انمٹ نشان چھوڑے ہیں۔ نیاز نے نثر کی معرفت شہرت پائی، جوش نے شاعری کی بدولت۔ گویا دونوں کی قلم فرسائی کا رخ ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھا اور بظاہر دونوں میں معاصرانہ چشمک کا کوئی واضح سبب نظر نہیں آتا، پھر بھی جوش اور نیاز کی باہمی چشمک خاص شہرت رکھتی ہے''۔

اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری علامہ نیاز فتح پوری کی جوش کے بارے میں لکھی ہوئی تحریر نقل کرتے ہیں۔ بقول نیاز فتح پوری:

''جوش کے یہاں علم و فکر کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انھوں نے پوری قوت کے ساتھ اظہار خیال نہ کیا ہو اور ان کی شاعری کے ہر رنگ کے چاہنے والے انھیں مل گئے۔ میں نے جوش کو ہمیشہ بڑا زبردست شاعر سمجھا۔ لیکن ان کی جن نظموں نے براہ راست میرے دل و دماغ کا سودا کیا ان میں ایک نظم ''فریب ہستی'' بھی ہے۔ اگر جوش اس نظم کے سواء اور کچھ نہ کہتے تو بھی میں حالی اور اقبال کی صنف

میں لاکر انھیں بٹھا دیتا''۔

یہ اہم مضمون دو شخصیت کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

کتاب کا پانچواں مضمون ''کراچی میں جوش کی پہلی آمد'' کے بارے میں ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جوش ملیح آبادی اور چند دیگر شعراء کو ہندوستان سے کراچی میں ہونے والے مشاعرے میں آنے کی دعوت دی تھی اس مشاعرے میں جوش کی آمد کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔

''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' اس کتاب کا چھٹا مضمون ''جوش صاحب کے مختصر سوانحی کوائف'' پر مشتمل ہے۔جس میں مصنف ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ملیح آباد کا تاریخی و جغرافیائی تذکرہ کرتے ہوئے جوش صاحب کا خاندانی تعارف پیش کیا ہے ۔جوش صاحب کا خاندانی نام شبیر احمد خان ، خود اختیار کردہ نام شبیر حسن خاں ۔ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ بمقام ملیح آباد لکھنؤ تخلص جوش وفات ۲۲ فروری ۱۹۸۲ مدفن اسلام آباد والد ،والدہ ،دادا ، پر دادا ، بھائی اور بہنوں کے نام تحریر کیے ہیں ۔جوش صاحب کی غیر رسمی تعلیم اور اساتذہ کے تذکرے کے بعد رسمی تعلیم اور اداروں کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔ جوش کی شادی اور اولاد ،ملازمت و مشاغل ، ادارت شاعری اور تلمذ کے بعد القابات اور تخلیقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔جو ہر طرح کار آمد و مفید ہے آخری باب میں جوش کی پانچ نظمیں کتاب کا حصہ ہیں ان نظموں میں شمع ہدایت ، جنگل کی شہزادی، تلاشی ، ماتم آزاری اور گل بدنی شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب ہر طرح قابلِ مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی اس اہم تصنیف ''جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری'' کا دوسرا حصہ فراق کے بارے میں ہے۔ فراق گورکھپوری شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اردو ادب کی تاریخ میں یوں تو درجنوں نام ایسے ہیں جنہوں نے شاعری اور تنقید دونوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے لیکن ان میں سے صرف دو نام ایسے ہیں جو شاعری اور تنقید دونوں کو متوازی صورت میں ایک خاص بلند سطح تک لے گئے اور دونوں میں رتبہ اعتبار حاصل کیا، میری مراد انیسویں صدی کے مولانا حالی اور بیسویں صدی کے فراق گورکھپوری سے ہے''۔

گویا جس طرح اردو تنقید میں فراق گورکھپوری کا مقام و مرتبہ بلند ہے اسی طرح شاعری میں بھی انکا اپنا مقام ہے۔ فراق مشرقی اور مغربی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے دونوں تہذیبوں سے بھرپور استفادہ کیا جس کا واضح اظہار ان کی شاعری میں نظر آتا ہے، اسی لیے ان کے اشعار میں زندگی اور ادب کا گہرا شعور ملتا ہے۔ بقول وزیر آغا :

''اردو غزل میں فراق کی آمد درحقیقت انگریزی کی تعلیم سے بہرہ مند شاعر کی آمد تھی۔ انھوں نے غزل میں وہ ارضیت پیدا کی جو برصغیر کے مزاج کا حصہ ہے۔ انھوں نے عشق کو انسانی فطرت کی تکمیل کا وسیلہ بنایا اور صنم کی پوجا سے روح کو سبکسار کیا''۔

اردو شاعری کا مزاج (ص۔ ۲۹۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا فراق کے بارے میں پہلا مضمون ''فراق گورکھپوری کی غزل ایک نیا رنگ و آہنگ'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''فراق کی شاعری کا مشرح مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے مزاج کو غزل سے طبعی مناسبت ہے اور وہ زندگی کے ہر انقلاب و انقباض کو غزل کے قالب میں ڈھال دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ فراق کی جملہ اصنافِ سخن اور شاعری کے وہی اجزاء دلکش و نظر گیر ہیں جن کا اسلوب اور رکھ رکھاؤ غزل جیسا ہے''۔

(صفحہ ۱۱۳)

فراق گورکھپوری کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ بقول محمد حسن عسکری

''فراق نے اردو شاعری کو نیا عاشق دیا ہے۔ اس نئے عاشق کی بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسا وقار پایا جاتا ہے جو اردو شاعری میں پہلے نظر نہیں آتا''۔

فراق کو اپنی محبت پر پورا بھروسہ اور اعتبار و یقین ہے۔ انکے یہاں محبت کا جذبہ بہت گہرا ہے جس میں درد کی کسک کے ساتھ ساتھ حسرت ہے، حزن ہے، سپردگی اور بیان کی ندرت پورے عروج پر ہے۔ اسی لیے تو کہا:

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

اپنے مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''فراق کے کلام میں بڑی خصوصیت ان کے تخیل کی رنگارنگی، تنوع پسندی اور جذبات و محسوسات کی فراوانی ہے۔ فراق کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ خیال بھی یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ غزل کی قلمرو تنگ نہیں بہت وسیع ہے اور اس میں شعور اور داخلیت و خارجیت کے سارے مسائل و معاملات اور جملہ انسانی افکار با آسانی جگہ پا سکتے ہیں۔ بے شمار محسوسات ایسے ہیں جن سے ہم آپ آئے دن دو چار ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں کر پاتے اور اگر محسوس بھی کر لیں تو یہ صلاحیت ہر آدمی میں کہاں ہوتی ہے کہ اپنے تاثر کو پوری طرح دوسروں تک پہنچا سکے۔ فراق کو اس نوع کے مسائل کے ابلاغ و اظہار پر حیرت انگیز دسترس ہے''۔

(صفحہ ۱۱۸)

بلاشبہ فراق گورکھپوری اردو کے صفِ اول کے غزل گو شعرا میں شامل ہیں کیونکہ انھوں نے غزل میں زندگی کے مسائل و حقائق کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ مخاطب بھی ہیں قریب بھی ہیں
ان کو دیکھوں کہ ان سے بات کروں

دلوں نے تجھ سے بھی جس کو بچا کے رکھا تھا
نگاہِ یار وہی درد آج کام آیا

چمکتے درد ، کھلے چہرے ، مسکراتے اشک
سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزم حیات

کبھی پابندیوں سے چھوٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
درو دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

فراق گورکھپوری کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا دوسرا مضمون ''فراق گورکھپوری بحیثیت رُباعی نگار'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اردو شاعری میں رباعی کے نمونے مختلف شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور سے اردو میں رباعی کہی جا رہی ہے امجد حیدرآبادی، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری نے اس سلسلے میں خوب نام پیدا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ان کی اکثر رُباعیاں ان کی غزلوں کی طرح ان کے انفرادی عشقیہ مزاج کی بچی ترجمان بن گئی ہیں۔ وہ غزلوں کی طرح رباعی میں بھی فطرت کے پیکر سادہ سے حسن پرکار کے رنگا رنگ پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ محبوب کے خدو خال کا اس قدر تفصیل و حسن کاری سے ذکر

کرتے ہیں کہ اکثر محبوب کو مجسم لا کھڑا کر دیتے ہیں اور رباعی نگاری میں مصوری کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔فراق کی رباعیوں میں محبوب کے زلف، لب، رُخسار، قد، آنکھ اور چال کے ذکر میں تکرار بھی نظر آئے گی۔دو رُباعیاں ملاحظہ کیجیے :

وہ نکھرے بدن کا مسکرانا ہے ہے
اس کے جوبن کا گنگنانا ہے ہے
کانوں کی لوؤں کا تھرتھرانا کم کم
چہرے کے تل کا جگمگانا ہے ہے

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لیتی ہے
دُکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تھمتے ہوئے ویرانے میں
سُکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

فراق کے کلام کی ایک نمایاں خوبی نادر استعارات اور تشبیہات کا استعمال ہے۔اس کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع بھی ان کے اشعار میں حُسن پیدا کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری

"ان کی رُباعیوں میں سماجی و سیاسی مسائل اور زندگی کے روزمرہ کے حقائق کا عکس بھی جگہ جگہ ملتا ہے"۔

مثلاً دو رباعیاں دیکھیے:

صحرا میں زماں مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کر سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کہ ہوں ، خلوت میں فراقؔ
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

کرتے نہیں کچھ کام تو کرنا کیا آئے
جیتے جی جان سے گزرنا کیا آئے
رو رو کے موت مانگنے والوں کو
جینا نہیں آسکا تو مرنا کیا آئے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف کا تیسرا مضمون ''فراق گورکھپوری اور نیاز و نگار'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں فراق اور علامہ نیاز فتح پوری کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ نیاز فراق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فراق کی شاعری کے متعلق میں بہت بلند پایہ رائے رکھتا ہوں جس کا اظہار میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے کر چکا ہوں۔ فراق ایک نقاد شاعر ہیں اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ فراق کی شاعری پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اُس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''نیاز فتح پوری نے فراق کو اُن کے ہم عصر و ہم عمر شعراء پر ہمیشہ ترجیح دی ہے اور جدید غزل گو کی حیثیت میں فراق کو منفرد جانا ہے''

اپنے اس مضمون میں فراق گورکھپوری کا خط بھی شامل کیا گیا ہے۔ جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام ہے۔ گویا یہ مضمون ہر طرح قابل مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا چوتھا مضمون ''فراق گورکھپوری سے سلسلہ ملاقات و مراسلت'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور فراق گورکھپوری کے درمیان مراسلت کا سلسلہ کافی عرصہ تک قائم رہا۔ فرمان صاحب نے مشاعروں میں شرکت کے سلسلے میں فراق کو کئی خط لکھے۔ جن کے جوابی خطوط فرمان صاحب کے پاس محفوظ رہے۔ اس مضمون میں مصطفیٰ زیدی سے فرمان صاحب نے اپنی ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے ساتھ ہی ڈاکٹر ابو محمد سحر کے خطوط کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یوں یہ مضمون بھی اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔

کتاب کا پانچواں مضمون ''فراق گورکھپوری کے مختصر سوانحی کوائف'' سے متعلق ہے۔ جس میں نام، تخلص، تاریخی پیدائش، جائے پیدائش، انتقال والد، والدہ کی وفات، بھائی بہن اور غیر رسمی تعلیم، انگریزی تعلیم مشغلہ، معاش و درس و تدریس اور اعزازت و انعامات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

چھٹا مضمون ''فراق کے شعری مجموعوں'' کے بارے میں ہے جو فرمان صاحب کی نظر سے گزرے، ان میں، روپ، شبنمستان، رمزو کنایات، مشعل، روح کائنات، غزل، غزلستان، شعلہ ساز، ہزار داستان، گل نغمہ، قابل ذکر ہیں۔

ہر مجموعہ کلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے صفحات کی تعداد سنِ اشاعت

مقامِ اشاعت کے ساتھ ساتھ بعض بعض جگہ نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔اس طرح

تحقیق کرنے والوں کے لیے آسانی پیدا کی گئی ہے۔

ساتواں مضمون کلام پر مشتمل ہے جیسے ''میری پسند'' کا عنوان دیا گیا

ہے۔اس باب میں ''فراق کی غزلیات''،''منظومات''،رباعیات اور متفرقات

شامل ہیں۔

کتاب کے آخر میں صاحب کتاب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے

کوائف تفصیل سے دیے گئے ہیں۔۲۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب

انتہائی کارآمد اور مفید ہے۔شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے

اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

''چند نعت گویانِ اُردو'' پر ایک نظر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اُردو ادب کی خدمت میں عرصۂ دراز سے مصروف ہیں اور اپنے عہد کی ممتاز اور قد آور علمی و ادبی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ اُردو کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ معروف محقق اور مستند نقاد بھی ہیں۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی کاموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ آپ کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے آپ کو ۱۹۸۵ء میں باوقار سول اعزاز ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا۔ آپ نے اُردو زبان و ادب کے ہر شعبے کو اپنی تحریروں سے نوازا ہے۔ فنِ شعر و شاعری مثلاً مثنوی، منظوم، داستان، غزل، رُباعی، قطعہ، ہائیکو یا نثری اصناف مثلاً: تذکرہ نگاری، تنقید، تحقیق، مسائل زبان، املا، انشاء رسم الخط، لغت نویسی غرض کہ کوئی گوشہ بھی آپ کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔ آپ کے علم و فضل کی کثیر جہتوں میں نعت شناسی بھی شامل ہے۔ ''اُردو کی نعتیہ شاعری'' نعت کے موضوع پر آپ کی ایک مستند تصنیف ہے جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ آپ نے نعتیہ شاعری سے متعلق جو پیمانے و معیارات مقرر کیے ہیں ان پر اب نعت کے میدان میں خوب کام ہو رہا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب کو صنفِ سخن کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ نعت اور عقیدۂ رسالت کا مفہوم، نعت کی ہیئت و موضوع وغیرہ پر جامع اظہارِ خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تازہ تخلیق ''چند نعت گویانِ اُردو'' بھی نعت شناسی کے بارے میں آپ کی محبت و عقیدت کا حوالہ ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر فرمان

فتح پوری کے مختلف نعت گو شعراء پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جس کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''میں نعتیہ ادب کے بارے میں اپنی پہلی کتاب کی اشاعت کے بعد بھی نعتیہ ادب کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ کبھی تفصیلی مضمون کی صورت میں کبھی کسی نعتیہ مجموعہ کے دیباچے کے طور پر کبھی کسی مجموعہ کلام پر تبصرے کے انداز میں اب یہی منتشر ذخیرہ ''چند نعت گویانِ اُردو'' کے عنوان سے کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے''۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ تازہ تصنیف مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمتہ اللہ علیہ سے لے کر خالد عرفان کے نعتیہ مجموعۂ کلام ''الہام'' تک کل ستائیس (۲۷) مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں کچھ مضامین تفصیلی ہیں اور کچھ مختصر تاہم مضامین میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے جو قارئین کو علم سے سیراب کرتے ہیں۔ پہلا مضمون مولانا احمد رضا خاں صاحب کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''عاشقانہ جذبات کے اظہار میں سادگی اور پاکیزگی کا جو رچاؤ شروع سے آخر تک حضرت احمد رضا بریلوی کے مجموعہ نعت ''حدائق بخشش'' میں نظر آتا ہے وہ اُردو کے دوسرے نعت گو شعراء کے یہاں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے یہاں غزل کے پیرائے میں لمبی لمبی نعتیں ملتی ہیں اور بعض نعتوں میں بڑی مشکل زمینوں اور ردیفوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی محبت کا تیز دھار سنگلاخ زمینوں کو

چیرتا ہوا اس طرح گزر گیا کہ شادابی اور زرخیزی کے جو آثار مولانا احمد رضا خاں صاحب کی ان نعتوں میں پیدا ہو گئے ہیں وہ دوسروں کے ہاں نرم اور ہموار زمینوں میں بھی نظر نہیں آتے"۔

مولانا احمد رضا کا نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

واہ کیا جود و کرم ہے شۂ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

☆☆☆☆

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی نعتیہ شاعری کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اقبال نے خودی کے ذریعے جو فلسفۂ حیات پیش کیا ہے وہ حقیقتاً دین مصطفوی ہی کی شاعرانہ تعبیر و تفسیر ہے۔ خودی کی ترتیب و تکمیل کے لئے جب وہ آئین فطرت کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں تو ان کی مراد اخلاقِ محمدی ﷺ اور اسوۂ رسول ﷺ کی پابندی و پیروی سے ہی ہوتی ہے"۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

علامہ سیماب اکبر آبادی کی نعت گوئی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''سیماب کی شاعری اپنے ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے اُردو کی عام نعتیہ شاعری سے بہت مختلف ہے۔ نعتیہ شاعری سے انہوں نے تادیب نفس اور اصلاح معاشرہ کا وہی کام لینا چاہا ہے جو نعت گوئی کا اصل مقصود تھا اور جس کی بناء پر حضور اکرم ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ کو نعت گوئی کی اجازت دی تھی''۔

علامہ سیماب اکبر آبادی کا نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

عروسِ فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب تیرا
مری رسائی سے دُور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا

محشر رسول نگری کی مسدس ''فخر کونین'' کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

''آنحضرت ﷺ کی مدحت و توصیف میں اچھے نعتیہ قصائد اور نظمیں تو کہی گئی ہیں، لیکن حضور ﷺ کی زندگی اور سیرت کو تاریخی صحت کے

ساتھ نظم کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ آخر کار محشر رسول نگری کی نظر اس اہم ترین موضوع پر پڑی اور انہوں نے "فخرِ کونین" کے نام سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے جلو میں اس طرح لے لیا کہ انہیں کا ہو کر رہ گیا"۔

محشر رسول نگری کی مسدس سے نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

نظروں سے چومتا ہوں مدینے کے بام و در
کرتا ہوں پھر ثنائے شہنشاہِ بحر و بر
دشوار ہے یہ مرحلۂ نعت کس قدر
میں چل رہا ہوں تیغِ برہنہ کی دھار پر
سرمست ہوں اگرچہ فروغِ نشاط سے
رکھتا ہوں ایک ایک قدم احتیاط سے

امین راحت چغتائی کے نعتیہ کلام کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے ہے کہ ان کی

"نعتیہ نظمیں بھی اور نعتیہ غزلیں بھی دونوں حُسن و خیال و حُسن عمل کی یکجائی کے حوالے سے ایسی شیر و شکر ہوگئی ہیں کہ معنوی اعتبار سے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ان کا ایک شعر نذر کرتا ہوں۔

وہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ایمان و یقیں ہے
کہ سیرت جس کی قرآنِ مبیں ہے"

امین راحت چغتائی نے کیا خوب کہا:

وہ آقا ﷺ نورِ ایمان و یقین ہے
کہ سیرت جس کی قرآنِ مبیں ہے
درودوں کی صدائیں، دل سے اُٹھیں
مرا آقا ﷺ مرے کتنا قریں ہے
محمد ﷺ نام ہی دلکش بہت ہے
اسے جس طرح بھی دیکھو حسیں ہے

حضرت ستار وارثی کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

''اُن کے نعتیہ کلام میں التزام واہتمام یہ کیا گیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے جملہ صفاتی اسمائے گرامی کو عنوان و موضوع بنا کر اشعار کہے گئے ہیں۔ ہر نام کے حضور ایک مکمل نعت بطور نذرانۂ عقیدت واحترام سے پیش کی گئی ہے۔ یہ اندازِ پیش کش بھی اپنی ندرت رکھتا ہے اور ندرت یہ ہے کہ ہر نام کے معنوی رموز و نکات کی روشنی میں اشعار کہے گئے ہیں اور اس طرح ہر صفاتی نام کو پیکرِ نعت بنا دیا گیا ہے۔''

جناب ستار وارثی کا نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

اللہ کے حبیب ﷺ دو عالم کے تاجدار
لاکھوں سلام آپ ﷺ پر اے شاہِ ذی وقار
میں کیفِ بے خودی میں بصد عجز و انکسار
سجدے کروں حضور ﷺ کی چوکھٹ پہ بار بار

جناب رشید وارثی کے مجموعۂ کلام ''خوشبوئے التفات'' کے بارے میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے ہے کہ

''رشید وارثی صاحب نے نعت گوئی کے موضوع پر کئی زاویوں سے توجہ فرمائی ہے، تحقیق و تنقید، تدوین، ترتیب، تزئین اور تحسین ہر زاویے سے طبع آزمائی کی ہے اور اُردو نعت کے ذخیرۂ شعر و ادب کو مالا مال کیا ہے''۔

جناب رشید وارثی نے کیا خوب کہا:

کس نازِ آفریں کا جہاں میں وُرود ہے

عرشِ بریں سے بارشِ عطرِ دُرود ہے

آمد ہے آج سرورِ خیر الانام ﷺ کی

خوشبو مہک رہی ہے درود و سلام کی

جامی بدایونی کا نعتیہ مجموعہ ''زادِ آخرت'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے اُن کی نعتیہ شاعری کے بارے میں فرمان صاحب کی رائے یہ ہے کہ:

''جامی بدایونی کے یہاں سیرتِ محمدی ﷺ اور شمائل نبوی ﷺ کے بیان میں جو لطافت اور حلاوت در آئی ہے وہ تو اپنی جگہ ان کے کمالاتِ فن کا حیرت انگیز اظہار ہے ہی، لیکن اس اظہار میں محبت کی جو تڑپ اور رُوح کی جو بے چینی، دل و نظر کی وارفتگی، طبیعت کی جو عاجزی و رفتارگی، جسم و جاں کی جو سپردگی، احساسِ ذات کی جو گمشدگی اور لب و لہجہ کی جو شائستگی و پاکیزگی نظر آتی ہے وہ ان کی ایسی

انفرادیت ہے جو حضورﷺ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ شیفتگی و توفیقِ الٰہی کے بغیر آدمی کو میسر نہیں آتی۔ جامی صاحب کو یہ شیفتگی و توفیق بحمداللہ میسر ہے اور اس سے بطریق احسن کام لیا ہے"۔

"مدحتِ رسولﷺ" کے شاعر زاہد فتح پوری کے نعتیہ شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فرماتے ہیں:

"زاہد فتح پوری زندگی بھر نعت کہتے رہے اور اپنے لئے نعت گوئی کو سامانِ آخرت جانا اور زندگی کے ہر ہر قدم پر حضور نبی کریمﷺ کی راہنمائی کو اپنے لئے سرمایۂ دل و جاں سمجھا"۔

زہے وہ شوق کہ ہو جس میں جستجوئے رسولﷺ
خوشا وہ قلب کہ ہو جس کی آرزوئے رسولﷺ
زباں پہ ذکرِ محمدﷺ سدا رہے زاہد
وہ زندگی ہے کہ ہو وقفِ گفتگوئے رسولﷺ

"ذکرِ ارفع" کے شاعر مبارک مونگیری کی نعتیہ شاعری کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"مبارک مونگیری نے بھی حضور اکرمﷺ کے اوصافِ مبارکہ کی ہمہ رنگی و ہمہ جہتی کو اپنے دامنِ خیال میں سمیٹنے کیلئے بیتوں کے سارے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان کی نعت گوئی دین و دنیا دونوں میں ان کی سرخروئی کا وسیلہ ثابت ہوگی"۔

مبارک مونگیری کا نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

تری ذات عظمتِ کُل نبی، تری شان شانِ تمام ہے
جہاں جبرئیل کے پر جلیں وہ بلند تیرا مقام ہے
جو ہے بادشاہوں سے بھی سوا ترے آستاں کا غلام ہے
اسے کہیں سکیں گے انسؓ ہی کچھ یہ بتا سکیں گے بلالؓ ہی

جناب حنیف اخگر کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمان فتح پوری صاحب لکھتے ہیں:

''انہوں نے صرف یہی نہیں کہ اپنی طبع زاد زمینوں اور بحروں میں قابلِ صد تحسین اشعار کہے ہیں، بلکہ اساتذۂ قدیم اور نہایت معروف شعراء کی زمینوں اور بحروں میں بھی کامیاب نعتیں کہہ کر اپنی قادر الکلامی اور غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا ہے''۔

جناب حنیف اخگر نے کیا خوب کہا:

توفیقِ نعت گوئی ہے اللہ کا کرم
کاوش یہ ہے ہنر کی نہ زورِ بیاں کی ہے
تمام عمر میں نعت و سلام لکھتا رہوں
تمام عمر اسی میں تمام ہوجائے

جناب اعجاز رحمانی کی نعتیہ شاعری کے بارے میں فرمان صاحب کا خیال ہے کہ:

''ان کی نعتیہ شاعری کی معنوی سطح خاصی بلند ہے، پھر یہ بھی نہیں کہ انہوں نے نعت گوئی کے بارے میں غیر ضروری صناعی یا بے جا

تکلفات سے کام لیا ہو۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے پورے جوشِ عقیدت اور ولولے کے ساتھ کہا ہے''۔

جناب اعجاز رحمانی کے دو شعر دیکھتے چلیے:

ہر دور میں رہے گا جو دُنیا کا رہنما
اخلاقِ مصطفیٰ ﷺ ہے وہ کردارِ مصطفیٰ ﷺ
مدحت سرا رسول ﷺ کے انسان ہی نہیں
اللہ کا بھی شغل ہے اذکارِ مصطفیٰ ﷺ

پروین جاوید کی نعتیہ شاعری کے بارے میں فرمان صاحب نے تفصیلی مضمون تحریر کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ:

''اللہ نے پروین جاوید کو جہاں قابلِ رشک تخلیقی قوت سے نوازا ہے وہیں اُنہیں نعت گوئی کا غیر معمولی سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔ پروین کی نعتیہ شاعری میں روضۂ اقدس کی زیارت کا جو ذوق و شوق بھرپور انداز میں اُبھرتا نظر آتا ہے وہ ان کے عشقِ رسول ﷺ کی گواہی ہے''۔

پروین جاوید نے کیا خوبصورت اشعار کہے:

کھلے لب حبیبِ ﷺ خدا کہتے کہتے
دوبارہ ملے مصطفیٰ ﷺ کہتے کہتے
ہوئی دل کو تسکیں دعا پڑھتے پڑھتے
مقدر بنا مجتبیٰ ﷺ کہتے کہتے

شاعر حمد و نعت طاہر سلطانی نعتیہ شاعری کے حوالے سے نہایت معروف شخصیت کے مالک ہیں، انہوں نے اپنی شاعری صرف حمد و نعت تک محدود رکھی ہے۔ اُن کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقمطراز ہیں:

''طاہر سلطانی صاحب کی نعتیہ شاعری کے مطالعے کے بعد جو بنیادی بات قاری کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حمد و نعت اُن کا محبوب مشغلہ و موضوع ہے اور اس کی بنیاد اور اس کا محرک اُن کی حرارتِ ایمانی اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مقدسہ سے والہانہ عقیدت و شیفتگی ہے اور اسی سرمایۂ عشق و محبت کو اپنے لئے ذریعۂ نجات اور ذریعۂ مغفرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی نعتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نعت گوئی اُن کے مضطرب دل اور بے قرار روح کے لئے باعثِ تسکین اور موجب راحت ہے۔ ان کے ایک ایک شعر میں حضور ﷺ کی عقیدت و محبت جھلکتی ہے اور عشقِ رسول ﷺ کی مستی و سرشاری میں ڈوبی ہوئی یہ فضا پڑھنے والے کی آنکھ بھی نم کر دیتی ہے''۔

شاعرِ حمد و نعت طاہر سلطانی کے دو شعر ملاحظہ کیجئے

مدینے کی جب یاد آتی ہے دل کو
تو پلکوں پہ موتی سجاتے ہیں آنسو

ہو میسر جو مجھے خاکِ مدینہ یا رب
میرا مدفن مرے آقا ﷺ کا نگر ہو جائے

جناب عبدالمالک مضطر کی نعتیہ شاعری کے بارے میں اپنی کتاب ''چند نعت گویانِ اُردو'' کے صفحہ ۱۴۷ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''مضطر کی شاعری اُردو کی مترّوجہ روشِ نعت گوئی سے بہت الگ ہے۔ وہ اُردو کے عام نعت گو شعراء کی طرح صرف غزل کی ہیئت میں اسیر ہو کر نہیں رہ گئے، بلکہ اُنہوں نے اُردو کو حُسن و خیال و حُسن عمل دونوں اعتبار سے ملک و ملت کے درد کا درماں اور زخمِ دل کا مرہم بنا دیا ہے''۔

جناب عبدالمالک مضطر نے کیا خوب کہا:

چراغِ راہ رہے روح و جسم و جاں کے لئے
نبی ﷺ کا اسوۂ ہے ہر دور، ہر زماں کے لئے
فروغِ عشق نبی ﷺ روشنی جہاں کے لئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

جناب نثار بیانوی کے نعتیہ مجموعہ ''حمد و ثناء'' کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحریر کرتے ہیں:

''حمد و ثناء'' کے قارئین سے میری گزارش ہے کہ اس مجموعۂ شعری کو معمولی نہ جانیں، یہ کرامت وزن و بحر اور صداقت لفظ و بیان کے تعلق سے غیر معمولی مجموعہ ہے اور تخلیق و تحسین کے جذبات کو بے ساختہ اُبھارنے کے ساتھ ساتھ تنقید کی راہیں بھی دکھاتا ہے''۔

جناب نثار بیانوی کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:

حقیقت کے جلوے نظر آ گئے ہیں
اُٹھایا کبھی جب نقابِ محمد ﷺ
قیامت جسے کہہ رہا ہے زمانہ
حقیقت میں ہے وہ شبابِ محمد ﷺ
زباں پر دُرود و سلام آ گئے ہیں
جو دل نے کہا ہے جنابِ محمد ﷺ

رضی عظیم آبادی کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''رضی عظیم آبادی کا معتبر غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر نعت گویان میں بھی شمار ہونے لگا ہے۔ ان کا طرزِ فکر اور اندازِ نعت گوئی نے ان کی شاعرانہ شخصیت کو بھی یہ امتیاز بخشا اور اُردو کے جدید نعت گویان کو بھی رتبۂ اعتبار پر فائز کیا''۔

رضی عظیم آبادی کا نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:

زمانے میں سب سے حسیں ہیں محمد ﷺ
دلوں میں ہمارے مکیں ہیں محمد ﷺ
خدا نے کیا کیوں طلب آپ ﷺ ہی کو
رسولوں میں ایسے نگیں ہیں محمد ﷺ

''چراغِ مصطفوی ﷺ'' کے شاعر سراج الدین سراج کے نعتیہ کلام کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

”سراج الدین سراج ایک قادرالکلام شاعر ہیں اور انہوں نے اپنے نعتیہ جذبات کو مشکل اور آسان ہر قسم کی زمینوں میں ڈھال دیا ہے“۔

جناب سراج الدین سراج کا اظہارِ عقیدت ملاحظہ کیجئے:

رکھ دیا اپنا قلم یہ کہہ کے اُس معبود نے
اب قیامت تک نہ ہوگا اس سے بہتر آئینہ
جگمگائے جس کی ضو سے محفلِ کون و مکاں
شیش محلوں کو کہاں ایسا میسر آئینہ

راؤ مبین کی نعتیہ شاعری کے بارے میں فرمان صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

”اُن کی نعتیں بھی اُن کی غزلوں کی طرح ظاہر میں بہت سادہ لیکن باطن میں حد درجہ پُر کار اور حیات افروز ہیں“۔

جناب راؤ مبین نے کتنی سادگی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

درود جب ہمارے لبوں کی زینت ہے
عجیب کیف میں ڈوبی ہوئی طبیعت ہے
فرشتے فخر کریں جس کا تذکرہ کر کے
ثنائے رحمتِ عالم ہی وہ عبادت ہے

خالد عرفان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

”خالد عرفان کی نعتیں صرف اچھی نہیں، بلکہ بہت اچھی ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار دل کو لگتے ہیں اور زبان سے سبحان اللہ کہلواتے ہیں۔ فنِ

شعر کے حوالے سے یہ حُسن کمال نہیں، بلکہ حُسن کی دلیل ہے''۔

جناب خالد عرفان کے دو شعر دیکھئے:

امین ٹھہرے، امان ٹھہرے
حضور ﷺ رحمت نشان ٹھہرے

خدا نے مدعو کیا تھا اُن ﷺ کو
خدا کہ وہ مہمان ٹھہرے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب ''چند نعت گویان اُردو'' میں عبدالعزیز خالد، سید محمد یوسف علی، راقم علیگ، گہرا عظمی، محبوب الٰہی عطا، خان اختر ندیم نقشبندی اور جناب حنیف ساجد کی نعتیہ شاعری کے بارے میں بھی بھرپور اظہار خیال کیا ہے۔

اپنی کتاب ''چند نعت گویانِ اُردو'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شعرائے کرام کی فکر وفن اور تخلیقی کاوشوں کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے اُن کے اسلوب اور فنی محاسن پر روشنی ڈالی ہے اور ہر شاعر کی نعتیہ شاعری کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نعت کے باب میں آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گی اور آپ کی دلچسپی میں بھی اضافہ کرے گی''۔

''اردو کے چار بڑے شاعر'' ایک مطالعہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو ادب کے محققین وناقدین بحیثیت ماہرِ لسانیات، نقادو محقق اپنی مستند علمیت اور منفرد نقطہ نظر کی بدولت اہم مقام پر فائز ہیں۔آپ کی گراں قدر تخلیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔آپ نے اصنافِ ادب اور اہلِ قلم کے بارے میں ہمہ گیراور وقیع معلومات فراہم کر کے تاریخِ ادب کو کئی لحاظ سے وسعت دی ہے۔شخصیات کے حوالے سے میر تقی میر ،مرزا غالب ،علامہ محمد اقبال ، میر انیس ، حسرت موہانی ،فراق گورکھپوری ،نیاز فتح پوری ، جوش ملیح آبادی ،ڈاکٹر محمود حسین اور ادا جعفری جیسی شخصیات کے بارے پوری کتابیں شائع کی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "اردو کے چار بڑے شاعر"ڈاکٹر صاحب کی اہم تصنیف ہے جس میں میر تقی میر ،مرزا غالب ،میر انیس اور علامہ محمد اقبال کو شامل کیا گیا ہے۔

یہ درست ہے کہ میر تقی میر اردو غزل کی پہچان ہیں اور میر کی شناخت اردو غزل کے حوالے سے ہے،تاہم میر تقی میر نے اردو غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔میر نے غزل کے علاوہ تضمین ، مثنویات،قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، ہجویات واسوخت اور قصائد کی صورت میں بھی اردو کو بڑا سرمایہ فراہم کیا ہے۔میر نے بحیثیت تذکرہ نگار بھی اردو کے دامن کو وسعت دی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف "اردو کے چار بڑے شاعر میں "میر کے بارے میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون "مطالعۂ میر کے بنیادی ماخذ" کے عنوان سے ہے۔ جس میں فرمان صاحب لکھتے ہیں :

"میر کے فکروفن کے بارے میں رائے قائم کرنے کے بنیادی ماخذ صرف چند ہیں۔ ان میں کلیاتِ میر، نکاتِ الشعرا اور ذکرِ میر کو اوّلیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات"، "میر تقی میر حیات اور شاعری" از : خواجہ احمد فاروقی، "مقدمہ کلیاتِ میر" از : عبدالباری آسی کو بنیادی ماخذ کہا جاسکتا ہے"۔

ان بنیادی ماخذات کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑی عمدگی سے اپنا مضمون مکمل کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا مضمون "میر بحثیت تذکرہ نگار" بھی بہت اہم ہے۔ جس میں فنِ تذکرہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ اپنی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے" مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ کے صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں :

"نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے اور تنقیدِ سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر برہنہ اور واشگاف آرا پائی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے"۔

تنقیدی پہلو سے قطع نظر سوانحی و تاریخی اعتبار سے بھی "نکات الشعرا" کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :

"جن شعرا کا ذکر میر نے کیا ہے ان پر اور ان کے ماحول پر ایسی

روشنی پڑتی ہے کہ ہمیں چہرہ نگاری اور سماجی شعور کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے"۔

بقول خواجہ احمد فاروقی :

"میر نے اپنے تذکرے ایک سو سے زائد شعراء کے قلمی چہرے پیش کیے ہیں لیکن ان رنگا رنگ صورتوں میں خود ان کے چہرے کی بھی اصل جھلک موجود ہے۔اس جھلک میں جو باتیں بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں وہ ان کے مزاج کی شگفتگی اور خوش اخلاقی ہے"۔

(حوالہ: میر تقی میر حیات اور شاعری)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حوالوں کے ساتھ بڑی تفصیل سے میر کی تذکرہ نگاری کا جائزہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔کتاب کا تیسرا مضمون "میر تقی میر اپنی مثنویات کی روشنی میں" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں : "میر تقی میر اپنے عہد کے ایک اہم مثنوی نگار ہیں۔غزل کی طرح مثنوی میں بھی معیارِ سخن کو پوری طرح برقرار رکھا ہے۔اس اعتبار سے وہ ایک ممتاز مثنوی نگار ہیں۔ان کی بیشتر مثنویاں حسنِ بیان اور تاثیر کے لحاظ سے غزل جیسی ہیں"۔

میر کی مثنویاں کسی نہ کسی عشقیہ قصے پر مبنی ہیں۔ان میں ان کے ذاتی قصے بھی ہیں اور دوسروں کے بھی۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"میر کی مثنویوں کی تعداد اگرچہ کثیر ہے لیکن ان میں صرف بلند پایہ وہی ہیں جن میں کوئی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔"شعلہ عشق"،"جوان

عروس "، " مورنامہ "، "حکایتِ عشق "، "اعجازِ عشق "اور "دریائے عشق کی مثنویات" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں"۔

جذبہ کی صداقت اور شدت کے اعتبار سے میر کی عشقیہ شاعری میں جو اثر آفرینی، ہمہ گیری اور گھلاوٹ نظر آتی ہے ویسے ہی ان کی مثنویوں میں بھی اثر انگیزی اور شدت نظر آتی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑی تفصیل سے میر کی مثنویات پر روشنی ڈالی ہے۔"اردو کے چار بڑے شاعر" کا چوتھا مضمون "میر کا عشق اور ان کی عشقیہ شاعری "کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"میر کی شاعری اساسی طور پر عاشقانہ شاعری ہے۔ان کی شاعری میں جس عشق کا ذکر آیا ہے اس کا تعلق محبوبہ سے بھی ہے اور اس تہذیبی زندگی سے بھی جس میں ان کی محبوبہ اور وہ خود پروان چڑھے تھے۔ جوان ہوئے تھے۔احساس اور جذبہ کی شدتوں سے دو چار ہوئے تھے"۔

میر کی شاعری اساسی طور پر عاشقانہ شاعری ہے ۔انھوں نے جس اختصار و سادگی اور حسن کاری وسحر آفرینی کے ساتھ لطیف سے لطیف محسوسات کو غزل کے اشعار میں پیش کیا ہے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

میر تقی میر کے سلسلے کا آخری مضمون "میر کے مختصر سوانحی کوائف "پر مشتمل ہے جس میں ولادت ،نام، تخلص،عزیز واقارب ،میر کا معاشقہ اور میر کی

تصانیف کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح میر تقی میر کے بارے میں یہ کتاب نہایت اہم ہے۔

"اردو کے چار بڑے شاعر" کتاب کا دوسرا باب مرزا غالب کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اردو شعرا میں سب سے زیادہ دلچسپی غالب سے رہی ہے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تو مجھے غالب کا سارا دیوان زبانی یاد تھا" آج بھی جب اُن سے غالب کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو وہ دیوان غالب کے اوّلین مطلع یعنی :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

سے لے کر آخری غزل کے مطلع :

نویدِ امن ہے بیدار دوستِ جاں کے لیے

تک زبانی سُنا دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے غالب پر چھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ جو سب مقبول خاص وعام ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں غالب کے بارے میں چھ مضمون شامل ہیں۔ پہلا مضمون "غالب کا اندازِ فکر اور استقبالِ فردا" کے عنوان سے ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"غالب کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ زندگی اور فن کے بارے میں ان کی سوچنے کے انداز اور نتائج اخذ کرنے کی روش اپنے معاصرین اور اپنے عہد کے مروجہ اصول اور اقدار سے بہت مختلف تھی۔ ان کا مشاہدہ تیز، ادراک ہمہ گیر اور نگاہ دور رس تھی۔ وہ نئی چیزوں کو

اپنانے اور انھیں اپنے کلام میں راہ دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ الفاظ اور خیالات دونوں کو اپنانے میں یہ روش قائم تھی''۔

غالب کے کلام کی ان خوبیوں کی وجہ سے ان کے کلام کی مقبولیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ کتاب کا دوسرا مضمون "غالب کے کلام میں استفہام" کے عنوان سے ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''غالب اردو کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کلماتِ استفہام کی گہرائیوں اور لطافتوں کو شدت سے محسوس کیا اور استفساریہ اندازِ بیان میں پورا زور صرف کیا۔ انکے اسلوبِ بیان کی جدت کا راز بڑی حد تک اس اندازِ بیان میں پوشیدہ ہے۔ غالب نے جدتِ بیان میں عموماً استفہامیہ لب و لہجے سے کام لیا اور اپنی تخلیق کو جدت خیالی سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ شعریت کے نغمے دل کش سے دل کش تر ہو گئے''۔

کتاب کا تیسرا مضمون "غالب کے طلسم معنی پر ایک نظر" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"غالب نے قدیم تلمیحی کی مدد سے شوخی و ظرافت، طنز و تعریض، عزم و حوصلہ، ضبطِ نفس و ضبطِ عشق، فلسفہ و تصوف، اور حیات و کائنات کی گرہ کشائی کے جو مضامین پیدا کیے ہیں وہ یکسر نئے ہیں۔ ان کی قدرتِ زبان و بیان اور فنی دسترس کی داد دینی پڑتی ہے"۔

کتاب کا چوتھا مضمون "غالب کا طنز و ظرافت" کے عنوان سے لکھا گیا

ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ادب میں صرف طنز کا نہیں مزاح و ظرافت کا بھی اہم مقام ہے۔ غالب کے دیوان میں بھی اس قسم کے ظرافت آمیز اشعار ملتے ہیں۔ ان کا طنزیہ لہجے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھیں محض شوخ نگار نہیں بلکہ اردو کا پہلا طنز نگار سمجھنا چاہیے"۔

غالب کے طنز کا کمال یہ ہے کہ وہ براہِ راست کسی کو طنز کا نشانہ نہیں بناتے، وہ صرف اسلوب کی مدد سے خصوصی طنز کا لہجہ پیدا کر دیتے ہیں۔ کتاب کا پانچواں مضمون "غالب کا نفسیاتی مطالعہ" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ غالب کے نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ فرمان صاحب کا مضمون اس سلسلے میں بہت اہم اور قابلِ مطالعہ ہے۔ غالب کے سلسلے کا آخری مضمون "غالب نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں" بھی بہت اہم مضمون ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف "اردو کے چار بڑے شاعر" کا تیسرا باب "میر انیس" سے متعلق ہے۔ میر انیس نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن پھر غزل گوئی چھوڑ کر مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر ساری عمر مرثیہ گوئی میں گزار دی۔ انھوں نے رباعیاں بھی لکھیں لیکن ان کی شہرت مرثیہ نگار کے طور پر ہوئی۔ انھوں نے مرثیہ کی صنف کو کمال پر پہنچایا اور اسی صنف نے انھیں زندہ جاوید بنایا۔ فرمان صاحب نے اپنی کتاب میں میر انیس کے بارے میں چار مضمون لکھے ہیں۔ پہلا مضمون "میر انیس کے خاندان اور حالاتِ زندگی" کے

عنوان سے ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''میر انیس کا خاندان کئی پشتوں سے علم و فضل اور شعر و سخن کے لئے ممتاز و مشہور چلا آرہا تھا۔ ان کے دادا میر حسن اور والد میر خلیق نے اردو شاعری خصوصاً مرثیہ نگاری کی تاریخ میں وہ نام پیدا کیا کہ ان کا پورا خاندان اُردو کے محسنوں میں شمار ہونے لگا''۔

اپنے مضمون میں فرمان صاحب نے میر انیس کی پیدائش، مکتبی تعلیم، فن ، سپہ گری، صحت، لڑکپن، مزاج، شعر گوئی کا شوق مرثیہ گوئی، مرثیہ خوانی وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح دوسرا مضمون "میر انیس کی مرثیہ نگاری نوعیت و جامعیت" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

میر انیس کو فن مرثیہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اس فن میں جدتیں پیدا کر دیں اور اہل بیت کے کئی مرثیے لکھے جن میں انھوں نے سانحہ کربلا کے درد ناک واقعات اور حالات بڑے موثر اور پُر درد و غم انداز میں بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''میر انیس کی شاعری بلحاظ موضوع داخلی و خارجی شاعری کی جملہ خصوصیات پر محیط ہے اور ان کا اسلوب فن مرثیہ کے اسلوب کے ساتھ ساتھ دوسری صنفوں کے اسالیب کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے''۔

میر انیس نے مرثیہ نگاری میں واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، جذبات کی تصویر کشی، کردار نگاری، مکالمات، مناظر فطرت، میدانِ جنگ کا نقشہ،

گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف اور سماجی زندگی کے سارے واقعے بڑی عمدگی سے پیش کیے ہیں۔ڈاکٹر فرمان صاحب کی کتاب کا تیسرا مضمون "میر انیس اور محاسن زبان و بیان " کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ان کی زبان، حسن آفرینی اور اثر پذیری کا عجیب وغریب جادو جگاتی ہے اور یہ زبان کی جادواثری ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کا مرتبہ دوسرے مرثیہ نگاروں سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ان کی قادر الکلامی تخیل کی بوقلمونی کی مدد سے ہر بیان میں ایک طرح کی تازگی و شگفتگی پیدا کر دیتی ہے"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی کتاب کا چوتھا مضمون ''مراثی انیس بلحاظِ موضوع اور معنوی خصوصیات'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

''اردو کے چار بڑے شاعر'' میں چوتھا باب علامہ محمد اقبال سے متعلق ہے۔اس سلسلے میں چار مضمون کتاب میں شامل ہیں۔جن میں علامہ محمد اقبال کے حالات ِ زندگی اور ان کے فن کے چند پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔پہلا مضمون ''ماحول،زندگی اور شخصیت'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔جس میں انیسویں صدی کی آخری دہائیاں، سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کا سیاسی شعور، مسلمانوں پر اٹھارویں صدی کے سیاسی واقعات کا ردِعمل، علمی وادبی فضا، علامہ اقبال کے جدِّ امجد، برہمن زاد ہونے پر فخر، خاندانی حالات اور ماحول، تاریخِ پیدائش کا قضیہ، والدین اور ان کی تربیت کے اثرات، ابتدائی اور غیر رسمی تعلیم، مولانا سید میر حسن کا لُطف خاص۔لاہور میں پروفیسر آرنلڈ کی معیت۔اعلیٰ تعلیم

کے لیے انگلستان روانگی ،شادیاں،اولاد ،ملازمتیں، وکالت ، وضع قطع ،سیاحت ،حلقۂ احباب، سادگی وشرافت ، پُرکشش شخصیت ،لباس و غذا ،زبانوں سے واقفیت، انداز گفتگو،شعر گوئی کا عالم ،ترنم اور شعر خوانی ،فرصت کے مشاغل، آمدنی اور سلیقہ شعاری ،خودداری وقناعت ،قول وعمل کا فلسفہ معمولات کی پابندی ،خوش طبعی وظرافت ،تصوّف ودینی مسائل سے دلچسپی ،قرآن ورسالت حاصلِ زندگی ، وفات و وصیت کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے جب کے دوسرے مضمون کا عنوان ہے ''تصانیفِ اقبال'' اس مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ کی تصنیفات کی رنگا رنگی ، اسلوبِ نثر، نصابی تالیفات ،شعری مجموعے ،علم الاقتصادی پہلی باقاعدہ تصنیف ،فلسفہ عجم ،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ،مختلف مطبوعہ مقالات ورسائل ،کلیاتِ اقبال کی پہلی اشاعت ،باقیاتِ اقبال ، رختِ سفر ،سرودِ رفتہ ،شادِ اقبال ،انوارِ اقبال ، اقبال کے خطوط جناح کے نام ،اقبال بنام گرامی ، خطوطِ اقبال ،مضامین اقبال ،خطبات و تقاریر حرفِ اقبال ،خطباتِ اقبال ،گفتارِ اقبال سے متعلق بڑی تفصیل سے اس مضمون کو مکمل کیا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبال کے سلسلے میں تیسرا مضمون بعنوان ''اقبال کا فن اور نظریۂ فن'' شاملِ کتاب ہے جس میں آرٹ یا فن کیا ہے؟ تخلیقِ فن اور حسن آفرینی، حسن کی ماہیئت اور جمالیات کے مفکرین ،شعروادب میں حسن آفرینی کی نوعیت، علامہ کا افادی نقطہ نظر ،تصورِ فن کی ارتقائی منزلیں ،مختلف ادوار ،فن میں رمزو ایمائیت کی اہمیت ،شاعر کا خلوص یا خون جگر ،ادب میں مقصدیت کا مقام ،شاعری اور فلسفے کی حدود ،فنونِ لطیفہ میں شاعری لطیف ترین ،شاعری میں قومی اور بین

الاقوامی زندگی کا عکس۔ حیاتِ انسانی میں شاعری اور شاعر کا منصب، تخلیق و تعمیر کا تعلق، شاعری، قوت کی مظہر و خالق، ادب برائے ادب سے بیزاری، افادی ادب کی تائید و تخلیق شاعری وسیلۂ تبلیغِ مقاصد، شاعری اور نصب العین سے اس کا رشتہ، منطقی اور شعری صداقتوں کے بارے میں اقبال کا موقف، رجائی لب ولہجہ اور خوش آئند مستقبل کی بشارت، شاعری، غیر معمولی تخلیقی عمل، موسیقی مصوری، اور فن تعمیر کا جمال و جلال، مسلمانوں کے کارنامے، فنونِ لطیفہ کی اہمیت اور تمدنِ انسانی کی تاریخ میں ان کا مقام جیسے موضوعات پر مشتمل یہ مضمون نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

کتاب کا آخری مضمون ''اقبال کا تصورِ عقل و عشق'' ہے جس میں عشق اور اس کے مترادفات، کلامِ اقبال کا مرکزی نقطہ، محبت کی شاعرانہ تعبیر، عشق اور خودی کا تعلق، عشق ایک طاقتور محرکِ حیات، کار فرمائیاں اور کارکشائیاں، اردو، فارسی شاعری میں عشق کی روایت، صوفیاء کا عشق، وحدت الوجود اور اس کے معتقدات، اقبال کا ردعمل اور نقطہ نظر، عشق زندگی کا ایک رجائی پہلو، فنانی الشیخ سے گریز، طلب دیدار اور وصال کا تصور، ہجر و وصال کا نیا موقف، عشق اور علم و فکر کی رسائیاں، عشق کے کارنامے، عقل و عشق کی پختگی و خامی، دانش برہانی اور عشق۔ اقبال کا انفرادی تصور کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اقبال کا نظامِ فکر میں عشق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ایسی اہمیت جسے نظر انداز کر کے کوئی شخص ان کے فلسفۂ حیات سے بہرہ مندی

اوران کی شاعری سے لطف اندوزی کا دعویٰ نہیں کرسکتا''۔

اردو کے ان چاروں بڑے شعراء کے بارے میں لکھی گئی یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی

اکتوبر 2013

''صرف شاعرات'' پر ایک نظر

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے فرمایا تھا:

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''

یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے بے شمار میدانوں میں خواتین اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کرواچکی ہیں۔ کتاب اور قلم سے بھی خواتین کا رشتہ بہت مضبوط ہوچکا ہے۔ نثر ہو یا شاعری، خواتین قلمکار ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ''صرف شاعرات'' جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ جس میں ۲۲ شاعرات کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے مضامین تحریر کیے ہیں۔

اس کتاب میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''مردوں کے دوش بدوش ہر زبان میں عورتوں نے بھی شعر و ادب کی ترقی میں برابر حصہ لیا ہے اور اُردو زبان بھی اس سلسلے میں مالا مال ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اُن کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جائے''۔

''صرف شاعرات'' میں جن شاعرات کی شاعری پر مضامین تحریر کیے گئے ہیں یہاں ان کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا پہلا مضمون محترمہ ادا جعفری کی شاعری سے متعلق ہے۔ جس میں انہوں نے شاعرہ کے کلام کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''ادا جعفری عہدِ حاضر کی اُن شاعروں میں سے ہیں جن کا شمار بہ اعتبار

طویل مشقِ سخن اور ریاضتِ فن صف اوّل کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آرائشِ خم کا کل کیلئے نہیں، اندیشہ ہائے دور و دراز کیلئے صرف کر رہی ہیں۔ شعر گوئی کو وقت گزاری کے مشغلے کے طور پر نہیں بلکہ فریضہ و عبادت جان کر اپنائے ہوئے ہیں۔ ادا جعفری کے رومانی مزاج کا فیضانِ خاص یہ ہے کہ وہ ان پر کسی عالم اور کسی رنگ میں بھی یاس و بے دلی کی کیفیت طاری نہیں ہونے دیتا۔ نیکی و بدی، تیرگی و روشنی اور طاقتور و کمزور کے معرکوں میں وہ بڑے حوصلوں کے ساتھ نیکی و روشنی اور کمزور کی طرف دار رہتی ہیں اور فتح مندی کو انسان کا مقدر جانتی ہیں۔ ان کی درد مند طبیعت خود کو جبر و ظلم کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور پاتی ہے۔ یہی مجبوری دراصل ان کی شاعری کا سب سے طاقتور محرک ہے"۔

نمونہ کلام:

کوئی کونپل نئی پھوٹی تو یہ جانا میں نے
دے دیا دہر کو جینے کا سندیسا میں نے

☆☆☆

میرا مذہب کہ محبت بھی ہے اُمید بھی ہے
پھر یہ کیسی مرے انداز میں محرومی ہے

محترمہ ادا جعفری نے زندگی کو کئی رُخ سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار اُن کی فنی دسترس کے آئینہ دار ہیں۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز کی

ترجمانی کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی شوخی اور ہجر و وصال کے احساسات کا اظہار بھی نہایت عمدگی سے کرتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''صرف شاعرات'' کا دوسرا مضمون برجیس طلعت نظامی کی شاعری سے متعلق ہے، اگرچہ برجیس طلعت نظامی افسانہ نگاری کے حوالے سے بھی خاصی شہرت رکھتی ہیں، لیکن اُن کا مجموعہ کلام ''بہار اور خزاں'' بھی اُن کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''برجیس طلعت نظامی ہمہ جہت صلاحیتوں کی مالک ہیں''۔

نمونہ کلام:

محبت کا قرینہ آگیا ہے
تری فرقت میں جینا آگیا ہے
نگاہیں منتظر ہیں آ بھی جاؤ
کہ ساون کا مہینہ آگیا ہے

''صرف شاعرات'' کا تیسرا مضمون بینا حسن کی شاعری کے بارے میں ہے، جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''بینا حسن کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر نہیں کہتیں، بلکہ شعر خود کو اُن سے کہلواتا ہے۔ زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ بینا جو کچھ دیکھتی ہیں اُسے دوسروں کو دکھانے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ بینا حسن شاعری کو کھیل نہیں سمجھتیں، بلکہ وہ فی الواقع دیدۂ بینا رکھتی ہیں''۔

نمونہ کلام:

روشن ہے اِک الاؤ مرے دل کے آس پاس
جذبوں کا اِک بہاؤ ہے ساحل کے آس پاس

☆☆☆

اگر خودی ہے تو ہم دل کے زخم سی لیں گے
یہی بہت ہے کہ ہم سر اُٹھا کہ جی لیں گے

بینا حسن کی غزلوں میں سادگی، پُرکاری، بے ساختگی اور سوز و گداز نمایاں ہیں اور یہی سادگی اور روانی ان کی غزل گوئی کا وصف ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تازہ تخلیق ''صرف شاعرات'' کا چوتھا مضمون پروین جاوید کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''اللہ نے پروین جاوید کو جہاں قابلِ رشک تخلیقی قوت سے نوازا ہے، وہیں اُنہیں نعت گوئی کا غیر معمولی سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔ اس عطائے خداوندی کی معرفت پروین جاوید کی نعت گوئی محاسنِ لفظی و معنوی سے مالا مال ہوگئی ہے''۔

نمونہ کلام:

کُھلے لب حبیب ﷺ خدا کہتے کہتے
دوبارہ ملے مصطفیٰ ﷺ کہتے کہتے
ہوئی دل کو تسکین دعا پڑھتے پڑھتے
مقدر بنا مجتبیٰ ﷺ کہتے کہتے

پروین جاوید کی نعتیہ شاعری قاری پر نہایت خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ ان کی نعتوں کا اپنا ایک خاص لب ولہجہ ہے جو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔

''صرف شاعرات'' کا پانچواں مضمون پروین نظیر سومرو کی شاعری کے بارے میں ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقمطراز ہیں:

''اُن کی شاعری کے ظاہر و باطن میں بڑی دل کشی اور موثر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے بعض اشعار میں فانی بدایونی کے فلسفہء غم کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ پروین نظیر کا پورا مجموعہء کلام جذبہ کی صداقتوں میں ڈوبا ہوا ہے اور لفظوں کے دل آویز پیکروں میں سجا ہوا ہے''۔

نمونہ کلام:

خواب ہو دل ہو یا تعلق ہو
ٹوٹنے کی صدا نہیں آتی

☆

اب میں ہوں زندگی کی سب آسائشوں سے دُور
گردش کے ساتھ بہنے کی خواہش کسے نہ تھی

پروین نظیر سومرو کی شاعری زندگی کے سچے احساسات وصداقتوں سے عبارت ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق اور زندگی کا تصور معاشرے کے سماجی حالات سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے غزلیہ شاعری کے جمالیاتی پہلوؤں کو بھی مناسب الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا چھٹا مضمون تسنیم فاطمہ کی شاعری کے بارے میں ہے۔ اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"تسنیم کی غزل قہر و مہر کے بیچ دباؤ کی شاعری ہے۔ ان کی لفظیات اور اس کا ظاہری پیکر کلاسیکی سہی، لیکن اس کی روح اور اس کا باطن یکسر نیا اور جدید ہے۔ اس اعتبار سے ہم عصر شاعری میں تسنیم کا ایک منفرد رنگ ہے اور یہ رنگ معنیٰ آفرینی و تازگی کا ایک ایسا بانکپن رکھتا ہے کہ کسی نوخیز شاعر کے سلسلے میں یہ معمولی نہیں غیر معمولی بات ہے"۔

نمونۂ کلام:

میں نے اس شخص سے آنسو کی وضاحت چاہی
جس کو موتی کے پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں

☆

آئینے کی بے لباسی چھپانے کیلئے
رات نے زلفیں میرے چہرے پر بکھرائیں بہت

تسنیم فاطمہ نے محبت اور رومانیت کو حقیقت پسندی سے ہم آہنگ کر کے شعری توازن قائم کیا ہے۔ ساتھ ساتھ اپنی غزلوں میں جمالیاتی اقدار اور فکری رجحانات کو بھی نمایاں کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ساتواں مضمون شاعرہ پروفیسر ثروت سلطانہ ثروت کی شاعری سے متعلق ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ثروت نے اپنی سوچ کی طبعی رو کو اپنی موجِ خیال سے اس طرح ہم

خیال کر رکھا ہے کہ انہیں اشعار کی صورت میں تخلیق کے موتی رولنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ اپنے لہجے و اثر آفرینی کے لحاظ سے اشعار کے یہ موتی حد درجہ آبدار بھی ہیں اور تہہ دار بھی، یہ آبداری اور تہہ داری چونکہ لفظ و معنی دونوں پر محیط ہے اس لئے ان کی شاعری صرف لمحۂ حاضر کی گرفت تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان کے روشن مستقبل کی ضمانت بن گئی ہے''۔

نمونۂ کلام:

شکلیں بدل بدل کر ملے ہر قدم پہ لوگ
کوئی بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

☆

آج تو غم ہے کل نہیں ہوگا
وقت سارے دکھوں کا مرہم ہے

ثروت سلطانہ ثروت کی شاعری میں افادی پہلو کے ساتھ ساتھ فنی اور جمالیاتی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر میں تازگی اور شگفتگی ہے۔

''صرف شاعرات'' کا آٹھواں مضمون حمیرا رحمان کی شاعری سے متعلق ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''شاعری کا حسن زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سچائی اور صداقت میں ہوتا ہے۔ صداقت سے مراد فلسفیانہ صداقت نہیں، بلکہ انسانی

تجربوں کی وہ نفسیاتی صداقت ہے جو واقعیاتی صداقتوں میں لپٹی ہوئی شاعری میں جگہ پا جاتی ہے۔ حمیرا رحمان کی شاعری کی خوبصورتی اور اس کی مقبولیت ان ہی صداقتوں پر ہے"۔

نمونۂ کلام:

لہو تو خرچ ہوا تیرے نام لکھنے میں
میری رگوں کے لئے سُرخ روشنائی دے

☆☆☆

اندھیارا بھی اپنے گھر کا کتنا اپنا لگتا ہے
اُس کے گھر سے تو سورج بھی بیگانہ سا لگتا ہے

حمیرا رحمان کی شاعری میں سچائی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں احساس کی شدت اور شعور کی گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نواں مضمون "رابعہ" فارسی کی پہلی شاعرہ کے عنوان سے بڑا تفصیلی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے:

"رابعہ فارسی کی پہلی قابلِ ذکر شاعرہ ہے، یہی نہیں بلکہ وہ فارسی ادب کے معماروں اور محسنوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ اس نے اس وقت فارسی میں شعر گوئی کی جب فارسی اپنے مقامی رنگ میں پہلے پہل ایران کی سرزمین میں قدم جما رہی تھی۔ اس کے کلام میں تکلف و تصنع یا رسمی باتوں کا ذکر نہیں، بلکہ آپ بیتی کی جھلک ہے۔ اسی لئے

اس میں حسن واثر وزور تینوں چیزیں موجود ہیں''۔

نمونۂ کلام:

تا بدانی درد و عشق داغ ہجر و غم کشی
چوں بہ ہجر اندر بہ پیچی پس بدانی قدر من

اپنا دسواں مضمون ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رشیدہ سلیم سیمیں کی شاعری کے بارے تحریر کیا ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:

''ان کی غزلوں کا لہجہ غزل کے مزاج کی طرح حد درجہ مترنّم، نرم اور سبک و شیریں ہے۔ ایسا سبک و شیریں جو مطالعہ کے ساتھ ساتھ اَن جانے طور پر قاری کے ذہن و دل میں اُترتا چلا جاتا ہے اور یہ ان کے کلام کی ایسی خصوصیت ہے جو برسوں کی ریاضت اور شعر سے طبعی مناسبت کے طفیل وجود میں آتی ہے''۔

نمونۂ کلام:

شام آتی ہے تو دل ڈوب کے رہ جاتا ہے
رات بھر راہ دکھاؤ گے کہاں آؤ گے

☆☆☆

ذرا جو سامنے آؤ تو چاند روشن ہو
ترس گئے ہیں در و بام چاندنی کے لئے

رشیدہ سلیم سیمیں کی شاعری سادگی، روانی اور پُرکاری کی عمدہ مثال ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا اگلا مضمون اُردو کی معروف شاعرہ رشیدہ عیاں کی شاعری سے متعلق ہے آپ لکھتے ہیں:

''رشیدہ عیاں کی شاعری کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک خیال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کی شاعری اس عہدِ خاص سے تعلق رکھتی ہے جو ان کا اپنا عہد ہے، جس میں انہوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھیں اور شعور کو پہنچیں ہیں۔ گویا ان کی شاعری لفظ و بیان اور فکر و احساس کی ہر سطح پر ایک واضح شناخت رکھتی ہے۔ ان کے یہاں جذباتی و نفسیاتی توانائیاں اور سچائیاں بھرپور انداز میں رونما ہوتی ہیں۔ ایسی توانائیاں اور ایسی سچائیاں جو بذاتِ خود بھی دلکش ہیں اور شاعرہ نے انہیں خوبصورت پیکر دے کر اور بھی دل آویز کر دیا ہے''۔

نمونۂ کلام:

حصارِ ذات سے باہر نکل کر جب دیکھا
تو اپنے غم سے فزوں دوسروں کے غم نکلے

☆☆☆

کم اجرتوں پہ لوگ رضامند ہوگئے
کیسا شکم کی آگ نے لاچار کر دیا

رشیدہ عیاں کی شاعری زندگی کی ترجمان بن گئی ہے، جس میں جا بجا عصری مسائل کا اظہار کیا گیا ہے۔

ریحانہ روحی کی شاعری کے بارے میں فرمان صاحب اپنے مضمون میں

رقم طراز ہیں:

''آج کی اُردو شاعرات میں ریحانہ روحی ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان کی شاعرانہ فکر، جذبوں کی سچائی، مشاہدات و محسوسات کا پُرتاثیر بیان اور اسلوب کی ندرت ان کے شعری مرتبے کو بلند تر کرتی جارہی ہے اور وہ قبولِ عام کی طرف تیزی سے قدم بڑھارہی ہیں''۔

نمونۂ کلام:

ایسا چراغ میں نے جلایا نہیں کبھی
جس میں کہ خود لہو مِرا شامل نہیں رہا

☆☆☆

فیصلہ مشکل ہے روحؔی دوست اور دشمن میں اب
ساری دنیا شعبدہ گر اور میں تنہا بہت

ریحانہ روحی کے کلام سے وحدتِ فکر کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے اشعار غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے درمیانی راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ز۔خ۔ش۔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''ز۔خ۔ش مشرقی اوضاع و اطوار کا نمونہ تھیں۔ روشن خیالی، وسیع القلبی، حریتِ فکری، اعلیٰ و ارفع، ترقی پسندانہ نظریات سے وابستگی بھی ان کی دیگر نمایاں خصوصیات ہیں جو ان کی شاعری میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔

سلاست و بلاغت اور کیف و تاثیران کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے''۔

نمونۂ کلام:

مِل جائے گا خدا تمہیں شوہر کی چاہ سے
سمجھو ذرا حقیقتِ عشق مجاز کو
پوشیدہ اپنے عیب کی صورت رکھو اسے
شوہر کا راز سمجھو نہ شوہر کے راز کو

سعدیہ روشن صدیقی کے بارے میں ''صرف شاعرات'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''سعدیہ روشن صدیقی کی شاعری کا دوسرا نام محسوساتی واقفیت اور جذباتی صداقت ہے۔ سعدیہ روشن کی شاعری بحیثیت مجموعی حیات افروز خیالات کا مرقع ہے''۔

نمونۂ کلام:

نظم و نثر جو بھی ہے منفرد ہی ہے
شعر ہی نہیں کہتی انقلاب لکھتی ہوں

☆☆☆

ایک لمحے کو تازہ ہوا جو چلی عمر بھر کی گھٹن کا خیال آ گیا
لاکھ مشکل سہی ضبط کرنا مگر اب تو خاصا ہمیں یہ کمال آ گیا

سعدیہ روشن صدیقی کی شاعری عہدِ حاضر کے مصائب اور مسائل کا

احاطہ کرتی ہے انہوں نے بہت سادگی کے ساتھ زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

سحر علی بھی عہدِ حاضر کی معروف شاعرہ ہیں۔ اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''سحر علی کی شاعری غم واندوہ سے عبارت ہونے کے وصف فکر انگیز ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو غم زدہ ہونے کے بجائے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ ان کے جذبوں کی صداقت ان کے ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے''۔

نمونۂ کلام:

ذرا پہلے میری بگڑی ہوئی تقدیر بننے دے
پھر اس کے بعد تو خود کو میری جاگیر بننے دے
تیرے دل کی حکایت بھی زمانے بھر میں گونجے گی
سحؔر تو اپنے جذبوں کو زبانِ میر بننے دے

سحر علی نے بڑی سادگی اور عمدگی سے اپنے جذبات واحساسات کو اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے۔

شاہدہ حسن کی شاعری کے بارے میں ''صرف شاعرات'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

''شاہدہ حسن بنیادی طور پر حرارت و حرکت اور روشنی کی شاعرہ ہیں۔ شاہدہ حسن کی شاعری عصری شاعری کے عمومی موسم سے ہم آہنگ بھی

ہے اور اس کے اثرات سے الگ بھی اور یہی اس کی انفرادیت ہے"۔

نمونۂ کلام:

جب خوشی سے آتی تھی خود ہوا دریچے تک
دل کو چھو رہا ہے پھر ایک غم کا جھونکا کیوں؟

تھے جس کی کہانیوں کے چرچے
کیا جانے وہ عشق اب کہاں ہے

شاہدہ حسن کی غزلوں میں سادگی اور پُرکاری ہے یا دوسرے الفاظ میں اُسے ہم فکری صداقت کہہ سکتے ہیں:

صادقہ فاطمی کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"صادقہ فاطمی صرف شاعرہ نہیں، بلکہ نہایت مہذب و شائستہ ذہن کی مالک باشعور و باخبر و وسیع المطالعہ شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام میں جا بجا میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور مجروح سلطان پوری کے اشعار کا جیسا خوبصورت اور برمحل مصرف کیا ہے، وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے"۔

نمونۂ کلام:

خود بھی چاک گریباں ٹھہرا، ہم کو بھی برباد کیا
کیسا قاتل شخص تھا جس نے حروفِ غزل ایجاد کیا

☆☆☆

کب سے بھٹک رہا ہے اندھیروں میں قافلہ
سب ہمسفر ہیں کوئی یہاں راہبر نہیں

"صادقہ فاطمی نے زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا احاطہ اپنے اشعار میں پوری طرح کیا ہے"۔

صالحہ کوثر کی شاعری کے بارے میں فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"اُن کی غزلوں کی بحریں چھوٹی چھوٹی ہیں، لیکن معنی خیز ہیں اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینے کی کوشش کی گئی ہے"۔

نمونۂ کلام:

عمر کی مسافت میں آبلے سلامت ہیں
زندگی کے رستوں میں حوصلے سلامت ہیں
پھول سے کبھی خوشبو دور رہ نہیں سکتی
جب تلک محبت کے سلسلے سلامت ہیں

سراج المنیر کی شاعری کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی غزلیہ شاعری حُسن و عشق کی پاکیزہ اور فکر انگیز روایات کی پروردہ ہے"۔

نمونۂ کلام:

کون ہے جو آشنائے غم نہیں
کون سی ہے آنکھ جو پُرنم نہیں

آج کل جو شہر کے حالات ہیں
کل نہ جانے ہوں گے بھی ہم یا نہیں

صبیحہ صباء کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"صبیحہ صباء کی شاعری علم و فکر اور جذبات کے دیرپا اور خوبصورت امتزاج کی شاعری ہے۔ اس میں نہ تو علم و فکر کا پُرشور غلبہ ہے اور نہ جذبات کا وہ اُبال جسے ہانڈی کا اُبال کہتے ہیں، بلکہ فکر و جذبے کے عناصر ایک دوسرے کی انگلی پکڑ کر نہایت شائستگی و خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ شائستگی و خاموشی شاعری کا کمال کہلاتی ہے"۔

نمونۂ کلام:

میرے ناراض شانوں کو تھپک کر بارہا کہنا
چلو چھوڑو، گلے شکوے، کبھی مانو مرا کہنا

☆☆☆

جھلملا اٹھتی ہیں اکثر، اس کی یادوں کی طرح
چوڑیاں جو ہاتھ میں ہیں اس کی پہنائی ہوئی

صبیحہ صباء کے ہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن کو مضمون آفریں، تخیل کی کرشمہ سازی اور شاعرانہ حُسن کی دل کشی و دل نشیں مثالیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعرانہ فکر اور اسلوب کی ندرت ان کے شعری مرتبے کو بلند تر کرتی ہے۔

عرفانہ عزیز کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

''عرفانہ عزیز کی شاعری تمام تر انفرادیت کے باوصف اپنی زمین، اپنی ثقافت، اپنی اقدار، اپنی شعری روایات اور اپنے اسالیب حیات سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے''۔

نمونۂ کلام:

آنکھوں پر رکھ دیئے ہیں قدم کس کی یاد نے
میرے لہو میں چاند رچا خواب کی طرح
دیتی تھی زندگی کی دُعائیں جسے نظر
اُترا مرے لہو میں زہر آب کی طرح

عرفانہ عزیز کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا فن جانتی ہیں اور یہ وصف ان کے ہاں بہت نمایاں ہے۔

غزالہ خاکوانی کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''غزالہ خاکوانی کی شاعری محسوسات و جذبات کی رنگا رنگی کے باوصف ہر قسم کی ہرزہ گوئی، ناہمواری، عدم شائستگی اور بے کیف ترکیب سازی سے پاک ہے جو کچھ ہے صاف و شفاف اور عام فہم زبان میں کہا ہے۔ ان کا خوبصورت لب و لہجہ اور جاندار اسلوب انہیں ہم عصر شاعرات سے الگ کرتا ہے''۔

نمونہ کلام:

اس آرزو میں زندگی ساری گزر گئی
ملنا ہے ایک دن مجھے اپنے حبیب سے

☆☆☆

یاربّ سیاہ رات کو اب تو سویر دے

ورنہ ہمارے خوابوں کے شیشے بکھیر دے

غزالی خاکوانی کی شاعری غمِ حیات کی عکاسی بھی ہے اور غمِ عشق کی بھی، بنیادی طور پر ان کی شاعری نسوانی احساسات، جذبات و کیفیات سے عبارت ہے۔

فاطمہ قیصری ریحانہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''قیصری نے اپنے دل کی آواز ہی کو شعر میں جگہ دی ہے۔ اُس وقت انہوں نے شعر کہا ہے جب ان پر وجہی طور پر دباؤ رہا ہے''۔

نمونۂ کلام:

حیرت نے مجھ سے چھین لی تابِ نگاہ بھی

جی چاہتا تھا کہ دیکھ کر سجدے میں گر پڑوں

تو کیا سمجھ سکے گا اگر تجھ سے کہہ بھی دوں

یکساں ہے غمگسار کہوں یا کہ چپ رہوں

فرح خیال کی شاعری کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

''فرح خیال صرف جذبات کی شاعرہ نہیں، بلکہ جذبات کے محرکات کی بھی شاعرہ ہیں، یعنی فکر و احساس ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور وہ دونوں کو ایک دوسرے سے آمیز کر کے نہایت سلیقے سے شعر کے پیکر میں ڈھال دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں''۔

نمونۂ کلام:

کتنی مدت سے نہیں آیا مجھے اس کا خیال
وہ بھی لگتا ہے مجھے بھول گیا ہو جیسے

☆☆☆

کوئی کام ایسا زندگی میں کر جاؤں
کہ نظروں میں کسی کی قدر اور پہچان ہو جائے

فرح خیال نے بڑی سادگی اور خوبصورتی سے اپنے جذبات و احساسات کو اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے۔

کنیز فاطمہ کرن کی شاعری کے متعلق فرمان صاحب کا خیال ہے:

"تخلیقی عمل کے حوالے سے کنیز فاطمہ کرن نظمیں، غزلیں، رُباعیات قطعات اور گیت سبھی کچھ کہتی ہیں اور خوب کہتی ہیں۔ ویسے ان کی نظمیں بھی عموماً غزل نما ہوتی ہیں۔ یعنی ان کی نظمیں اپنی معنوی کلیت کے ساتھ ساتھ احساس کے ایک رشتے سے مضبوطی سے بندھی ہوتی ہیں"۔

نمونۂ کلام:

تجھ سے جب مل کے میں آئی، میری آنکھوں کی چمک
میرے عارض کی دمک، دیکھ کے نظریں اُٹھیں
کتنی پیشانیاں سجدوں کی تمنا میں رہیں
کتنی بانہیں مجھے آغوش میں لینے کو بڑھیں

گلنار آفرین کی شاعری کے بارے میں اپنے تفصیلی مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"گلنار کی شاعری اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ غم دیدہ و ستم چشیدہ دل کی آواز ہے۔ ایسی آواز جو محبت اور صرف محبت سے عبارت ہے۔ یہ محبت جو گلنار کی ذات میں پوری کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ گلنار کی پناہ گاہ بھی اور قربان گاہ بھی۔ محبت ان کے من مندر کی ایسی دیوی ہے جس کی پرستش ان کی زندگی ہی نہیں ان کی زندگی کا حاصل بھی ہے"۔

نمونہ کلام:

گلنؔار ہر اک شعر سے ظاہر ہے ترا غم
اشعار کبھی یونہی سُنائے نہیں جاتے

☆☆☆

گزر کے آتی ہوں میں غم کے ریگ زاروں سے
نظر اُداس ہے دل ہے دُکھا ہوا میرا

گلنار آفرین کی غزلوں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں کی چاشنی موجود ہے۔

ماہ لقا چندا بائی کی شاعری کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اُردو شاعری کی تاریخ میں خاتون شاعرہ کی حیثیت سے ان کا نام اور کام تادیر زندہ رہنے والا ہے"۔

نمونۂ کلام:

ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے

پھول بننے کی تمنا میں جیئے بیٹھی ہے

مخفی امروہوی کی شاعری کے متعلق فرمان صاحب کی رائے ہے کہ:

"مخفی امروہوی کو فطری طور پر غزل کی صنف سے رغبت ہے، لہٰذا انہوں نے خالص غزل کے لہجے میں روایتی مضامین و موضوعات کو بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ پڑھتے پڑھتے گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ تو خود ہمارے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہورہی ہے۔ ان کا لب ولہجہ سادہ اور پُرکار اور زبان مفرس اور معرب الفاظ کے بجائے روزمرہ کی بول چال سے قربت رکھتی ہے"۔

نمونۂ کلام:

زمین قدموں کے نیچے سے کھینچنے والوں

ہمارے سر پہ ابھی آسمان باقی ہے

☆☆☆

وہ تصور میں جب نہیں ہوتے

روز و شب روز و شب نہیں ہوتے

مخفی امروہوی نے نہایت سادہ اور دلکش انداز میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی شاعری اتنی سبک اور سادہ ہے کہ پڑھنے

والے کے دل میں اُتر جاتی ہے۔

نجمہ عثمان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"نجمہ کی شاعری ذات کا نوحہ ہے اور حالات کا آئینہ ہے۔ نجمہ ایک روشن خیال اور درد مند دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ ان کے اشعار کی سبک روی و نغمگی اور ان کے طرزِ کلام کی سادگی صاف بتاتی ہے کہ وہ مصنوعی لفظی پیکروں سے بہت الگ ایک سچے اور روشن خیال شاعر کی حیثیت سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں"۔

جب سے سچ کا پیڑ پھل دینے لگا
میرا آنگن پتھروں سے بھر گیا

☆☆☆

تیرگی کو مٹا کے کیا کرتے
اپنا ہی گھر جلا کے کیا کرتے

"نجمہ عثمان کے اشعار میں جذبات کی سچائی اور محبت کے درخشاں نقوش کا بھرپور اظہار ہے۔ خیال کی پاکیزگی، زبان کی سادگی اور سوز گداز ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہیں"۔

نسیم سید کی شاعری کے بارے میں اپنے تفصیلی مضمون میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"نسیم سید کی شاعری بحیثیت مجموعی محض احساس کی شاعری نہیں بلکہ احساسِ غم کی شاعری ہے۔ لیکن نسیم سید کے شعور نے غم کو اپنی شاعری پر

مسلط نہیں ہونے دیا۔ ان کی ساری شاعری میں نظمیں ہوں یا غزلیں، غم کا ایک نشاط افروز نغمہ جاری نظر آتا ہے۔ یاس و بے دلی کا طوفان اُمنڈتا ہے، لیکن نسیم سید کا رجائی مزاج اس طوفان پر آسانی سے قابو پا لیتا ہے"۔

نمونہ کلام:

احساس کو ملتی نہیں اظہار کی خلعت
لفظوں کی اگر دھار پر کٹ کر نہیں دیکھا
رستہ کوئی معیار سے ہٹ کر نہیں دیکھا
قامت سے کسی سائے کے گھٹ کر نہیں دیکھا

نسیم سید نے اپنے اشعار میں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو فنی تجربے کی مدد سے پیش کیا ہے۔ اُن کا کلام جذبہ کی صداقتوں میں ڈوبا ہوا ہے اور لفظوں کے دلآویز پیکروں میں سجا ہوا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "صرف شاعرات" کا تیسواں مضمون نسیم کلثوم کی شاعری کے بارے میں اور انہوں نے نسیم کلثوم کو "غمِ نشاط کی شاعرہ" قرار دیا ہے۔ اپنے مضمون میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

"اپنے سفرِ حیات میں نسیم کلثوم کے رجائی مزاج اور حوصلہ مند طبیعت نے غمِ نشاط نہیں، نشاطِ غم کو راہبر اور شجرِ سایہ دار جانا ہے۔ کٹھن سے کٹھن مرحلوں کو نشاطِ غم کی رہنمائی اور دستگیری میں طے کیا ہے اور غمِ نشاط سے

بے نیازانہ گزر کر نشاطِ غم کی لازوال دولت و منصب تک پہنچی ہیں''۔

نمونہ کلام:

دوستوں کا کہنا تھا اب یہ جی نہیں سکتی
دیکھو کتنی ہمت سے زندگی گزاری ہے

☆☆☆

دنیا میں دوست سچا ملنا بہت ہے مشکل
مل جائے کوئی ایسا اس کو جُدا نہ کرنا

نوشی گیلانی اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں استاد ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب ''صرف شاعرات'' میں لکھتے ہیں:

''نوشی گیلانی کے شعری پیکروں میں معنی کی عجیب وغریب خوشبو ہے، پھولوں کی، رنگوں کی، تتلیوں کی، جذبوں کی صداقت کی، احساس کی، لطافت کی اور سوچ کی پاکیزگی و بلندی کی۔ یہ خوشبو اُڑی اُڑی پھرتی ہے اور قاری کے جسم و جاں کے در و بام کو معطر کرتی ہے''۔

نمونہ کلام:

اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل
ٹلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں ہے

☆☆☆

ہم لوگ جنوں کے عالم میں منزل کی طلب بھی بُھول گئے

اب دل کو بھلا سا لگتا ہے، صحرا میں عکس سرابوں کا

پروفیسر وحیدہ نسیم کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''وحیدہ نسیم کی شاعری فلسفہ و فکر کی شاعری نہیں، بلکہ حقیقی جذبوں اور سچے محسوسات کی شاعری ہے''۔

نمونہ کلام:

چند اشکوں میں رہ گئے ڈھل کر
حرف مطلب جو تھے زباں کے لئے

☆☆☆

زندگی تلخ ہے نسیمہ کیوں
کون جانے یہ راز کی باتیں

ڈاکٹر فرمان فتح کی کتاب ''صرف شاعرات'' کا آخری مضمون یاسمین گل کی شاعری کے بارے میں ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

عجیب شخص ہے پاس آئے تو بکھر جائے
وگرنہ دُور سے اکثر دکھائی دیتا ہے

☆☆☆

طبع رنگیں سہی اس کی مگر ہر لڑکی
پیرہن کی طرح تبدیل نہیں ہوسکتی

کتاب کے آخر میں اُردو شاعرات کے دو تذکروں کا تفصیل سے کیا
گیا ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ ''نگار پاکستان''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب ان عالموں اور دانشوروں میں شامل تھے جو نام ونمود سے بے نیاز ہوکر دن رات علم وادب کی خدمت کرتے رہے۔ علم وادب سے ان کا رشتہ زندگی بھر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خدمات پر تحقیقی کام مسلسل جاری ہے۔ جناب سید اصغر کاظمی کا فرمان فتح پوری صاحب سے گہرا رشتہ ہے۔ اصغر کاظمی فرمان صاحب کے حوالے سے مسلسل تحقیقی کام کرتے رہے ہیں اصغر کاظمی کی دو درجن سے زیادہ کتب میں سے کئی کتابیں فرمان صاحب کے بارے میں ہیں۔ امید ہے کاظمی صاحب اپنا ادبی سفر جاری رکھیں گے۔

پروفیسر شاہ پارہ شعبہ اردو
ڈاکٹر ضیاء الدین
کالج نارتھ ناظم آباد کراچی

Near Regal Chowk,
19 - Temple Road, Lahore.
www.alwaqarpublications.com
alwaqarpublications@gmail.com